محرم الحرام ۱۴۴۱ھ
ستمبر ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- بَدَءَ الاِسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں
  قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ
- رسول اللہ ﷺ کی مستقل سُنّت: دعوتِ دین

دعوتِ فکرِ اسلامی مہم

تنظیم اسلامی کا پیغام   نظامِ خلافت کا قیام

امیر محترم حافظ عاکف سعید ﷾ نے اپنے ویڈیو پیغام میں درج ذیل ہدایات دی تھیں ان کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر اور رفقاء کی یاد دہانی کے لیے ان کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

1. پہلا اور اہم ترین کام یہ ہے کہ اپنے تنظیمی فکر کو ایک بار پھر تازہ کرنے کی خاطر بنیادی تنظیمی لٹریچر کا مطالعہ کریں۔
2. دعوت کو صرف مثبت انداز میں پیش کریں۔ کسی فرد، گروہ یا جماعت کی مخالفت میں کوئی بات نہ کریں۔
3. کوئی شخص اگر آپ کو سننے سے انکار کرتا ہے یا سننے کے بعد تنقید کرتا ہے یا طنز کے تیر برساتا ہے تب بھی آپ ''اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ'' پر عمل کرتے ہوئے اُس سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور ہرگز کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کریں۔
4. انفرادی یا اجتماعی دعوت کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کریں جس سے عوام کو تکلیف پہنچے۔ (مقامات یا اوقاتِ کار کے حوالے سے)
5. فقہی مسائل پر گفتگو کرنے سے مکمل اجتناب کریں اور دعوتی گفتگو میں فرقہ وارانہ مباحث سے گریز کریں۔
6. عوامی اجتماعات میں ثقیل زبان اور غامض علمی اصطلاحات سے گریز کریں۔ ایسی باتیں لوگوں کو کنفیوز کر دیتی ہیں۔
7. مہم کے دوران ہر حال میں سمع و طاعت کا مظاہرہ کریں۔ اگر کسی کو عارضی طور پر آپ کا امیر مقرر کیا گیا ہو تب بھی اُسی کی سنیں اور مانیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم نے اُس کی تائید و توفیق کے حوالے سے دعوتی مہم کا جو عزم کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کام میں ہماری مدد فرمائے اور ہماری مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

www.tanzeem.org

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 68
شمارہ : 9
محرم الحرام 1441ھ
ستمبر 2019ء
فی شمارہ 40/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون
- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
رابطہ برائے ادارتی امور: +92 322 4585384
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - تاریخ تحریک آزادیٔ کشمیر — ادارہ
- **تذکرہ و تبصرہ** — 9
  - قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **بیانُ القُرآن** — 17
  - سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات ۱ تا ۲۵) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **کارِ رسالت** — 31
  - رسول اللہ ﷺ کی مستقل سُنّت: دعوتِ دین — انجینئر نعمان اختر
- **دعوت و عزیمت** — 46
  - متاثرکُن داعیان الی اللہ کی محنت اور ہماری ذمہ داریاں — انجینئر محمد رشید عمر
- **دعوتِ فکرِ اسلامی** — 55
  - آدابِ دعوت — محمد سہیل راؤ
- **مطالعۂ قرآن حکیم** — 65
  - اسلام کی سماجی اور معاشرتی اقدار — شجاع الدین شیخ
- **حقیقتِ ایمان** — 75
  - کیا رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر نجات ممکن ہے؟ (۲) — محمد سفیر الاسلام
- **انوارِ ہدایت** — 90
  - والدین کی قدر و منزلت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ تحریک آزادیٔ کشمیر

جموں وکشمیر جسے جنتِ ارضی بھی کہا جاتا ہے تقریباً ۴۸,۴۷۱ مربع میل پر پھیلی ہوئی ریاست ہے۔ یہ علاقہ براعظم ایشیاء کے تقریباً وسط میں اور برصغیر کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ اس مناسبت سے اسے ایشیاء کا دل اور برصغیر کا تاج بھی کہتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے اس نہایت اہم خطے کے شمال میں چین کا صوبہ سنکیانگ واقعہ ہے۔ اس کے مشرق میں تبت' جنوب میں بھارت' جنوب مغرب میں پاکستان اور مغرب میں افغانستان واقع ہیں۔ اگر داخلی طور پر دیکھا جائے تو ریاست جموں وکشمیر چار ذیلی علاقوں پر مشتمل ہے جو جموں' وادی' لداخ اور گلگت بلتستان کہلاتے ہیں۔

خطہ کشمیر ماضی میں بدھ مت کا مرکز رہا جبکہ مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ آٹھویں صدی عیسوی میں برصغیر پر مسلمانوں کے حملے کے بعد شروع ہوا۔ پہلی اسلامی حکومت کا آغاز چودھویں صدی کے آغاز میں اس وقت ہوا جب بدھ مت کے حکمران رنچن شاہ نے اسلام قبول کیا اور اسلامی نام صدرالدین اختیار کیا۔ پہلی باقاعدہ اسلامی حکومت کی بنیاد شاہ میر نے رکھی جو بعد میں سلطان شمس الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس خاندان نے کشمیر پر لمبا عرصہ حکومت کی اور کشمیر کو اسلامی تشخص میں رنگ دیا جو آج تک کشمیر کی پہچان ہے۔

اس خاندان کے بعد ۱۵۵۵ء میں ایک اور مسلمان خاندان چک کی حکمرانی قائم ہوئی' لیکن یہ خاندان اپنے اختلافات پر قابو نہ رکھ سکا' چنانچہ صرف ۳۱ برس بعد ہی ۱۵۸۶ء میں مغل بادشاہ اکبر نے کشمیر کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا لیا۔ جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال ہوئی تو احمد شاہ ابدالی کے پنجاب پر حملوں کے دوران ۱۷۵۲ء میں کشمیر افغانوں کے قبضے میں چلا گیا جو ۱۸۱۹ء تک قائم رہا۔ ۶۷ برس پر محیط اس عہد کے بعد کشمیر پر رنجیت سنگھ کی فوجوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور یوں کشمیر پر سکھوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ سکھوں کا یہ عہد کشمیر کی تاریخ میں ظلم و بربریت کا سیاہ دور ہے۔ سکھ

کشمیریوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے تھے۔ اگر کوئی کشمیری کسی سکھ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو قاتل کو صرف ۱۶ سے ۲۰ روپے تک جرمانہ کیا جاتا تھا' جس میں سے مقتول کے ورثاء کو دو روپے ادا کر کے بقیہ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جاتی تھی۔

۱۸۴۲ء میں جب سکھوں کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو فریقین میں معاہدۂ لاہور طے پایا۔ اس کے تحت کشمیر کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا جنھوں نے چند روز بعد اپنے ایک وفادار گلاب سنگھ ڈوگرہ کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکّوں کے عوض فروخت کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک معاہدہ انگریزوں اور گلاب سنگھ ڈوگرہ کے درمیان بھی طے پایا جس کے تحت وادی کشمیر اور اردگرد کے علاقے اپنی آبادی اور تمام اسباب و وسائل کے ساتھ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے حوالے کر دیے گئے۔ اسے معاہدۂ امرتسر کہا جاتا ہے۔

اقبال نے اس انسانیت سوز واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!

گویا ہر کشمیری کو صرف ۷ سکّوں کے عوض ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جبکہ زمین رشکِ فردوسِ بریں ۱۵۵ روپے فی مربع میل کے حساب سے پڑی۔ ڈوگرہ حکمران بھی اپنے پیشروؤں کی مانند مسلمانوں سے بے انتہا تعصب رکھتے تھے' یہاں تک کہ دوپہر سے پہلے مسلمانوں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو دوپہر سے پہلے کسی ڈوگرہ حکمران کے سامنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس دور میں بھی مسلمانوں نے اس ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی کہ جب مساجد کو اصطبلوں اور بارودخانوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اذان دینے اور خطبہ پڑھنے پر پابندی تھی۔ پونچھ کے مسلمان لیڈروں سردار سبز علی خان اور ملی خان کی کھالیں زندہ ہی اتروا دی گئیں' محض اس جرم میں کہ وہ ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم وستم کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔

انہی مظالم کے باعث ۱۹۲۹ء میں سرینگر میں شیخ عبداللہ نے ریڈنگ روم پارٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی زمانے میں جموں میں چودھری غلام عباس نے اے آر ساغر اور دیگر چند ساتھیوں سے مل کر ینگ مینز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ ینگ مینز نے بھی مسلمانوں کے حقوق کے لیے خاطر خواہ جدّوجُہد کی' لیکن یہ دونوں تحریکیں تحریک آزادی کا روپ نہ دھار سکیں۔

۱۹۳۱ء میں بریلی کے علاقے میں ایک مسجد شہید کر دی گئی اور ایک پولیس اہلکار نے جان بوجھ کر قرآن پاک کی بے حرمتی کی۔ ان واقعات سے مسلمانوں میں غم و غصہ پھیلنے لگا اور اس کا اظہار سڑکوں پر مظاہروں کی صورت میں ہونے لگا۔ پولیس نے بہت سے مظاہرین کو گرفتار کر لیا۔ جب ان کا مقدمہ عدالت میں چلا تو بہت سے مظاہرین عدالت کے باہر جمع ہوئے اور کارروائی سننے پر زور دیا۔ پولیس نے ان مظاہرین پر گولی چلائی اور یوں ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو ۲۷ افراد شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔ ان واقعات کی خبر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی اور مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ انھی حالات کے باعث کشمیر کے مسلمانوں میں اتحاد کی فضا ابھری اور ۱۴/اگست ۱۹۳۱ء کو پہلی بار جموں میں کشمیر ڈے منایا گیا۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ ٹھیک ۱۶ سال بعد اسی دن پاکستان آزاد ہوا۔ بہرحال ان واقعات کے بعد مسلمانوں میں اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کا جذبہ شدّومدّ سے پیدا ہوا جو کہ آج بھی زندہ ہے۔ اُس وقت اکتوبر ۱۹۳۱ء میں پورے پنجاب میں ''چلو چلو کشمیر چلو'' کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اس موقع پر برطانوی حکومت نے مداخلت کی اور ڈوگرہ راج کے مظالم کو روکنے کا کہا گیا۔ یوں یہ تحریک بھی تحریک آزادی کی مکمل شکل نہ اختیار کر سکی۔ انھی دنوں ۱۹۳۳ء میں سرینگر پتھر مسجد میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔

یہ تحریکیں اگرچہ تحریک آزادی کی شکل اختیار نہ کر سکیں لیکن اس کے باوجود ان تحریکوں کے باعث مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر اٹھی تھی اور وہ منظم ہو رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ہندوؤں کو شدید تکلیف ہوئی' چنانچہ انھوں نے بھی ہندو انتہا پسند تنظیم راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ کو کشمیر میں دعوت دی کہ وہ یہاں اپنے اڈّے قائم کرے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں آر ایس ایس نے اپنا کام شروع کر دیا اور جا بجا اس تنظیم کے مراکز کھل گئے۔ یہ مراکز بظاہر ورزش گاہ اور اکھاڑے کی مانند تھے کہ جہاں ہندو نوجوان جسمانی ورزشیں کرتے تھے لیکن درحقیقت یہ ریاست کی ہندو اقلیت کو مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جنگی تربیت فراہم کرنے کے مراکز تھے۔ یہی مراکز بعد ازاں مسلمانوں کے خلاف منظم مظالم اور قتل عام کے لیے استعمال کیے گئے۔

ایک طرف وادیٔ کشمیر میں ڈوگرہ راج کے خلاف کاوشیں جاری تھیں جبکہ دوسری طرف ہندوستان بھر میں تحریک آزادی کو ایک نیا رخ مل چکا تھا۔ علامہ محمد اقبال کی طرف سے ایک الگ

وطن کا نظریہ پیش کیا جا چکا تھا۔ برصغیر میں جوں جوں مطالبۂ پاکستان زور پکڑتا گیا ریاست میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کا پلّہ بھی اسی رفتار سے بھاری ہوتا گیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فارمولا منظور ہوا تو برصغیر کی ۵۶۲ ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے جغرافیائی اور معاشرتی و سماجی حقائق کے پیش نظر اپنی اپنی آبادی کی خواہشات کے مطابق بھارت یا پاکستان سے الحاق کر لیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی ۸۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی ۶۰۰ میل لمبی سرحد پاکستان سے ملتی تھی۔ ریاست کی واحد ریلوے لائن سیالکوٹ سے گزرتی تھی اور بیرونی دنیا کے ساتھ ڈاک اور تار کا نظام بھی پاکستان سے جڑا تھا۔ ریاست کی دونوں پختہ سڑکیں راولپنڈی اور سیالکوٹ سے گزرتی تھیں۔ ان سب حقائق کے پیش نظر ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق لازمی طور پر ایک قدرتی اور منطقی فیصلہ ہونا چاہیے تھا' لیکن مہاراجہ ہری سنگھ اور کانگریسی لیڈروں کے عزائم اس فیصلہ کے بالکل برعکس تھے۔ اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر سازش کا جال بنا جس کے پھندے میں مقبوضہ ریاست کے بے بس اور مظلوم باشندے آج تک بری طرح گرفتار ہیں۔

جب ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا تو ریڈکلف نے واضح طور پر جانبداری کا مظاہرہ کیا اور ناانصافی پر مبنی کئی فیصلے کیے۔ ان سب میں وادی کے حوالے سے اہم یہ تھا کہ گورداسپور کا علاقہ جو مسلم اکثریت کا حامل تھا اسے بھارت کے ساتھ شامل کر دیا گیا تاکہ بھارت کو ریاست تک پہنچنے کا زمینی راستہ دیا جا سکے۔ مہاراجہ پہلے ہی کانگریسی لیڈروں کے ساتھ یہ ساز باز کر چکا تھا۔ اس بات کی خبر جب غیور کشمیری باشندوں کو ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ وہ ڈوگرہ راج سے لڑیں گے اور ریاست کا الحاق پاکستان سے کروائیں گے۔ لیکن اس سے قبل ڈوگرہ فوج نے صوبہ جموں میں مسلمان اکثریت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور مسلمانوں کے قتل عام اور ریاست بدری کا طریقہ کار اپنایا گیا۔ چنانچہ اس وقت جموں میں لاکھوں مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور بہت سوں کو اغوا کر لیا گیا۔ بہت سی عورتیں جنھیں پاکستان لے جانے کا کہہ کر ٹرکوں میں بٹھایا گیا' وہ آر ایس ایس کے غنڈوں کے حوالے کر دی گئیں' جنھوں نے ان کی عصمت دری کی اور بعد ازاں انھیں قتل کر دیا۔ یوں جموں میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ (باقی صفحہ 97)

بَدْءُ الاِسْلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن: منبع وسرچشمۂ ایمان ویقین، جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اَتم

ازقلم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

واقعہ یہ ہے کہ ''بَدءُ الاسلام'' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں —— ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جِدّ و جُہد کے ضمن میں ''آلۂ انقلاب'' کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسری جہاد فی سبیل اللہ، جو جامع عنوان ہے آپ ﷺ کی اِس جِدّ و جُہد کے مختلف مدارج ومراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲﴾ اور ﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱﴾ کی چونکا دینے والی صدائیں اور ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳﴾ اور ﴿اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳﴾ کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچا دی اور ﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۝۲ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳﴾ کی کیفیت پیدا کر دی۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

پھر —— اِسی کی آیاتِ بیّنات تھیں جنہوں نے ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (الحدید:۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادّہ پرستی، حُبِ عاجلہ اور حیوانیتِ محضہ کے ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾[1] ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کُلّیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے۔

مزید برآں — وہی تھا جو ﴿مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾[2] بھی بن کر آیا اور ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾[3] بھی۔ چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب وتجلیۂ روح بھی! گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر —— الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمد رسول اللہ ﷺ کا پورا عملِ دعوت واصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو، پورے چار مقامات پر آنحضور ﷺ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل وآخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعۃ: ۲)

''سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت۔''

قرآن کا کارنامہ ایک جملے میں بیان کیجیے تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی، اس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی،

(۱) ''اندھیرے ہی اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر!'' (النور:۴۰)

(۲) ''تمہارے رب کی طرف سے نصیحت''

(۲) ''سینوں کے امراض کے لیے شفاء'' (یونس:۵۷)

نقطۂ نظر بدلا‘ اَقدار بدلیں‘ عزائم بدلے‘ امنگیں بدلیں‘ شوق بدلے‘ دل چسپیاں بدلیں‘ خوف بدلے‘ اُمیدیں بدلیں‘ اخلاق بدلے‘ کردار بدلے‘ خلوت بدلی‘ جلوت بدلی‘ انفرادیت بدلی‘ اجتماعیت بدلی‘ دن بدلا‘ رات بدلی‘ حتیٰ کہ ﴿تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (۴) کے مصداق آسمان بدلا‘ زمین بدلی‘ الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی —— اور اس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات!

بقول علامہ اقبالؒ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است! (۵)

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود! (۶)

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں‘ جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘۔

اس تصادم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ’’مجاہدہ مع النفس‘‘ کو ’’افضل الجہاد‘‘ قرار دیا گیا۔ (۷) پھر جب

(۴) (جس دن) زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے سوا (کسی اور شکل میں) اور آسمانوں کو بھی (بدل دیا جائے گا)‘‘ (ابراہیم:۴۸)

(۵) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ دوں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(۶) (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے‘ اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!

(۷) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى)) ’’افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو۔‘‘ (سلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانی:۱۴۹۶)

ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں‘ سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادم کی صورت میں ہوا‘ جس کا مقصد قرار پایا ’’تکبیرِ ربّ‘‘ (۸) یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اُس کی حاکمیتِ مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تا کہ ’’اُس (اللہ تعالیٰ) کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!‘‘ (۹) —— اور اس کی آخری منزل ہے ’’قتال فی سبیل اللہ‘‘ جس کا منتہائے مقصود معیّن ہوا ان الفاظ میں کہ:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

’’اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ ’فتنہ‘ بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت کُلّیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے!‘‘

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ (الحجرات)

’’مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر‘ پھر شک میں نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال اور اپنی جانیں۔ حقیقت میں یہی ہیں سچے!‘‘

واضح رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر ’حصر‘ کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں ’’حقیقی ایمان‘‘ اور ’’قانونی اسلام‘‘ کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مؤمن صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین‘ اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد

(۸) الفاظِ قرآنی کی رو سے ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثر) اور بقول اقبالؒ:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

(۹) سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ

اور قتال۔ ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں‘ چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (symbols) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصور میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابُدی ہیں!

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی ’’نشاۃِ اولیٰ‘‘ یا غلبۂ دینِ حق کا دورِ اوّل بلاشائبہ ریب و شک نتیجہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعلقِ قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی‘ ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے‘ جس میں تمام تر بحث انسان کے ’’ظاہر‘‘ سے ہوتی ہے‘ باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ گویا بقول علامہ اقبال ع ’’بندوں کو گنا کرتے ہیں‘ تولا نہیں کرتے!‘‘ —— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ مکارمِ اَخلاق یا مواعظِ حسنہ کو۔ حتیٰ کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدم ہو جاتا ہے —— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو‘ خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں‘ اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے۔ اصولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر۔

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور (emphasis) ایمان کے بجائے اسلام پر‘ یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلّۂ اربعہ[10] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور

سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عمل داری وسیع ہوتی گئی‘ قرآن مجید تو ’’چار میں کے ایک‘‘ کی حیثیت میں پس منظر میں ’’گم‘‘[11] ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[12]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجتاً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[13]۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت —— بلکہ صرف ایک ایسی ’’کتابِ مقدس‘‘ بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آ سکتے ہیں[14]۔ اور اس طرح آنحضور ﷺ کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک

---

(10) اصولِ شریعت چار ہیں: (ا) قرآن‘ (ب) سنت رسول ﷺ (ج) قیاس‘ (د) اجماع۔ انہیں ’’اَدِلّہ اَرْبَعہ‘‘ کہا جاتا ہے۔

(11) حضرت اکبر کا بہت پیارا شعر ہے:

صوم ہے ایمان سے‘ ایمان غائب صوم گم　　قوم ہے قرآن سے‘ قرآن رخصت قوم گم!

(12) چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں‘ لیکن اصولِ تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کُل دو رسالے ملتے ہیں۔ ایک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رسالہ ’’اصولِ تفسیر‘‘ اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا رسالہ ’’الفوز الکبیر‘‘۔

(13) اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں　　حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں!

(تم کب تک یونانیوں کا فلسفہ پڑھتے رہو گے؟ کبھی حکمتِ قرآنی اور حکمتِ ایمانی بھی تو پڑھو!)

(14) ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎

بآیاتش ترا کارے جزیں نیست　　کہ از یاسینِ او آساں بمیری

(اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے۔)

زمانہ وہ آئے گا کہ: ((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ))(مشکوٰۃ : کتاب العلم) ''اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔''

بعینہٖ یہی معاملہ ''جہاد'' کے ساتھ بھی ہوا۔ جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی' جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا' خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور ساری توجہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہو گئی' جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ ''چار میں کے ایک'' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے' جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اِس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا۔ چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اَذکار و اَوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (short cut) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنی قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم' کفر و فسق اور زُور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار' نیکی اور راست بازی کی ترویج' کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جِدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ —— گویا فی الجملہ اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مؤمن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے' وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی' اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ اللہ! کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ع ''ببیں تفاوتِ رہ از

کجاست تا بہ کجا''(۱۵) کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جذبۂ جہاد سے سرشار' بیک زبان' رجز یہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا(۱۶)

(صحیح البخاری)

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک متنبّی اور اُس کی ذُرّیتِ صُلبی و معنوی نے تو جہاد بِالسّیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

''کہ رہوارِ یقینِ ما بصحرائے گماں گم شد!''(۱۷)

---

(۱۵) فاصلے کی دوری تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں نکل گئے!

(۱۶) ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رکھی ہے اور اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

(۱۷) ہمارے یقین کا گھوڑا گمان کے صحرا میں گم ہو گیا ہے! ❁❁❁

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس

• فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد

صفحات: 120 قیمت: 90 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ حٰمٓ السَّجدۃ

تمہیدی کلمات

سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا دوسرا نام سورۂ فُصّلت ہے۔ دراصل ''السجدۃ'' کے نام سے قرآن مجید میں دو سورتیں ہیں اور دونوں ہی حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ الاحزاب سے متصلاً قبل کی سورۃ السجدۃ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے' اس نسبت سے اس کا پورا نام الٓمّٓ السجدۃ ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر وہ صرف ''السجدۃ'' کے نام سے معروف ہے' اس لیے ان دونوں میں فرق واضح کرنے کے لیے زیرِ مطالعہ سورت کو حٰمٓ السجدۃ کہا جاتا ہے۔

سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ''دعوتِ توحید'' ہے۔ دعوت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے ایک ایسے شخص کا تصور ذہن میں لائیے جس نے عقیدۂ توحید کو اختیار کر کے اپنے دل و دماغ کو باطل نظریات اور مشرکانہ خیالات سے پاک کر لیا ہے۔ نورِ توحید سے اس کا سینہ منور ہو گیا ہے اور اُس نے خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری طرح جھکا لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ شخص کسی معاشرے کا حصہ ہے اور کسی بھی معاشرے میں رہتے ہوئے ایک توحید پرست شخص کے سامنے توحید کے حوالے سے درج ذیل دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہو گی۔ یا تو اس معاشرے میں اللہ کا دین غالب ہو گا اور وہاں اسلامی حکومت ہو گی' یا پھر وہاں اللہ کا دین مغلوب ہو گا۔ دین کے غلبے کی صورت میں تو ایک توحید پرست شخص کے لیے اللہ کی بندگی اختیار کرنا اور ہمہ تن اللہ کا بندہ بن کر رہنا آسان ہو گا۔ اور ایسی صورت میں اس سے تقاضا بھی یہی ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں معاشرے کی صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ یعنی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نقشہ اللہ کی مرضی اور اس کے دین کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ اس نظام کے تحت عام لوگ بڑی آسانی اور سہولت سے اللہ کی اطاعت اور بندگی میں اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔ لیکن اگر کسی معاشرے یا ملک میں باطل نظام غالب اور اللہ کا دین مغلوب ہو تو ایک مؤمن یا موحد شخص کے لیے اپنی پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت اور بندگی میں ڈھالنا ممکن

ہی نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی بھی شخص اللہ کی بندگی پانچ' دس' پندرہ فی صد تک یعنی جزوی طور پر ہی کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک توحید پرست شخص اگر ایسے معاشرے میں رہنے پر مجبور ہے جہاں باطل کا غلبہ ہے اور ملک میں مجموعی طور پر کفر کا نظام قائم ہے تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ چنانچہ ایک موحد شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی صورتِ حال کو ذہنی طور پر تسلیم (reconcile) نہ کرے۔ وہاں رہتے ہوئے وہ احتجاج (protest) کی کیفیت میں زندگی بسر کرے' ہر وقت اس باطل نظام کو بدلنے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی فکر میں رہے اور عملی طور پر اس کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرتا رہے۔ اس جدوجہد کے حوالے سے اس کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریاتِ زندگی کم سے کم اور ناگزیر حد (subsistence level) تک پوری کرنے کے بعد اپنی تمام تر صلاحیتیں' اپنا وقت اور اپنے وسائل باطل نظام کو اُکھاڑ پھینکنے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی کوشش میں کھپا دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی یہ جدوجہد اور کوشش گویا باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔

نظریاتی طور پر اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ عملی طور پر اس جدوجہد کی ترتیب و تدریج کیا ہو گی۔ ظاہر ہے یہ کام کسی اکیلے آدمی کے بس کا تو ہے نہیں' اکیلا چنا تو بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنا بہرحال کوئی آسان کام نہیں۔ اس کام کے لیے طاقت ناگزیر ہو گی اور طاقت حاصل کرنے کے لیے جمعیت درکار ہو گی۔ جبکہ جمعیت کی تشکیل کے لیے دعوت الی اللہ کو عام کرنے کی ضرورت ہو گی اور یہی سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کے کام کا بیڑا ہر اُس شخص کو اٹھانا ہو گا جس نے توحید کو ایک نظریہ کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ گویا ہر موحد شخص کو اپنے نظریے کا داعی بن کر میدانِ عمل میں اترنا ہو گا' دوسروں کو قائل کرنا ہو گا اور اپنے ساتھ ملانا ہو گا' تاکہ غلبۂ حق یا اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے جمعیت اور طاقت مہیا ہو سکے۔

دعوت الی اللہ کے بارے میں ایک اہم بات یہ بھی لائق توجہ ہے کہ دعوت کا آلہ اور ذریعہ (medium) قرآن مجید ہے۔ اس حوالے سے داعیانِ حق کے لیے قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے کہ وہ انذار اور تبشیر کا ذریعہ بھی قرآن کو بنائیں' تذکیر و تذکر کے لیے بھی

قرآن سے رجوع کریں اور خود اپنے تزکیۂ نفس کے لیے بھی قرآن ہی کا سہارا ڈھونڈیں۔ غرض وہ دعوت کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر مرحلے پر ہدایت و رہنمائی قرآن سے حاصل کریں۔ قرآن میں اس حوالے سے قرآن کا ذکر بار بار آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کا ذکر سولہ مرتبہ ہوا ہے۔ گویا اس سورت کا تانا بانا ہی قرآن کے ذکر سے بُنا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں بھی قرآن کے ذکر کی تکرار ملتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ اس حوالے سے تیسرے نمبر پر ہے‘ چھ رکوعوں پر مشتمل اس مختصر سی سورت میں چھ مرتبہ قرآن کا حوالہ آیا ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی مدِنظر رکھنا چاہیے کہ زیرمطالعہ سورتوں کا مرکزی مضمون ’’توحید عملی‘‘ ہے اور ’’دعوت‘‘ کا یہ مضمون بھی اسی مضمون کا تسلسل ہے۔ اس تسلسل کو ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے زیرمطالعہ سورتوں کے مضامین کی اس ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے دہرا لیجیے کہ سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن میں توحید عملی کا مضمون انفرادی سطح پر بیان ہوا ہے۔ سورۃ الزمر میں توحید فی العبادت پر زور دیا گیا ہے جبکہ سورۃ المؤمن میں توحید فی الدعاء کے حوالے سے تاکید ہے۔ البتہ عبادت اور دعا کے ساتھ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کی شرط ان دونوں سورتوں میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس کے بعد سورۂ حٰمٓ السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ میں توحید عملی کا مضمون بتدریج اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہے۔ اجتماعیت کے حصول کے لیے چونکہ جدوجہد کا آغاز دعوت سے ہوتا ہے‘ اس لیے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون دعوت الی اللہ ہے۔ البتہ اس مرکزی مضمون کے ساتھ ساتھ مکی سورتوں کے عام مضامین اور بعض علمی نکات بھی اس سورت میں ملیں گے۔

آیات ۱ تا ۱۲

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا
لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا
يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ
وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶﴾ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۷﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۸﴾ قُلْ اَئِنَّكُمْ
لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ
رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹﴾ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ
اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ
دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾
فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا
السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ①﴾ ’’ح‘ م۔‘‘

آیت ۲ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾ ’’(اس کتاب کا) اتارا جانا ہے اُس ہستی کی طرف سے جو بے حد مہربان‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند بھی ہے اور اس رحمت میں دوام اور تسلسل بھی ہے۔

آیت ۳ ﴿كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ ’’یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں‘‘

یعنی قرآن میں ہر چیز اور ہر موضوع کو تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ (discretely) بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام (فُصِّلَتْ) اسی جملے سے لیا گیا ہے۔

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ③﴾ ’’قرآنِ عربی کی صورت میں‘ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہوں (یا علم رکھنا چاہیں)۔‘‘

آیت ۴ ﴿بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ﴾ ’’بشارت دینے والی اور آگاہ کر دینے والی۔‘‘

یہ کتاب بشارتیں بھی دیتی ہے اور خبردار بھی کرتی ہے۔ حضور ﷺ بھی تبشیر اور انذار کا حق قرآن مجید کے ذریعے سے ہی ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ مریم میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾ ’’پس ہم نے تو آسان کر دیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں‘ تاکہ آپ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار

کریں اسی کے ذریعے جھگڑالو قوم کو۔‘‘

﴿ فَاَعۡرَضَ اَكۡثَرُهُمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ۝۴ ﴾ ’’تو ان کی اکثریت نے اعراض کیا اور وہ سنتے ہی نہیں ہیں۔‘‘

آیت ۵ ﴿ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِىۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ ﴾ ’’اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں‘‘

﴿ وَفِىۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ ﴾ ’’اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے‘‘

مشرکینِ مکہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں ادب و احترام کے دائرے میں نہیں بلکہ آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے گستاخانہ اور استہزائیہ انداز میں کرتے تھے۔ وہ لوگ مختلف طریقوں سے آپؐ کے سامنے اپنے اس موقف کو بار بار دہراتے رہتے تھے کہ آپؐ جس قدر چاہیں اپنے آپ کو ہلکان کر لیں‘ آپؐ کی یہ باتیں ہمارے دلوں میں اتر کر اپنا اثر نہیں دکھا سکتیں۔ آپؐ کی ان باتوں کو نہ تو ہم سنتے ہیں اور نہ ہی ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں‘ بلکہ ایسی باتیں سننے کے حوالے سے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپؐ خواہ مخواہ ہمیں تنگ نہ کریں۔

﴿ وَّمِنۡۢ بَيۡنِنَا وَبَيۡنِكَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ۝۵ ﴾ ’’اور ہمارے اور آپؐ کے درمیان تو ایک پردہ حائل ہے‘ تو آپ اپنا کام کریں‘ ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔‘‘

یہ گویا ان کی طرف سے چیلنج تھا کہ آپؐ جو کچھ کر سکتے ہیں کر لیں‘ جتنا چاہیں زور لگا لیں ہم آپؐ کی اس دعوت کو چلنے نہیں دیں گے۔

آیت ۶ ﴿ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو بس ایک انسان ہوں تمہاری طرح کا‘‘

مخالفین کی طرف سے چیلنج کا گستاخانہ انداز دیکھئے اور حضور ﷺ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ یعنی میں نے تم لوگوں کے سامنے نہ تو خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی میں نے کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس ایک انسان ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔

﴿ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ ’’میری طرف وحی کی جا رہی ہے کہ تمہارا

معبود ایک ہی معبود ہے‘‘

ان سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ توحید ہے‘ اس لیے سورت کے آغاز میں ہی اس مضمون کو نمایاں کیا جا رہا ہے۔

﴿ فَاسۡتَقِيۡمُوۡۤا اِلَيۡهِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ؕ ﴾ ’’تو اُسی کی طرف سیدھا رکھو اپنے رخ کو اور اس سے استغفار کرو۔‘‘

جو خطائیں اور غلطیاں اس سے پہلے ہو چکی ہیں ان کی معافی مانگو اور کفر و شرک کے عقائد سے توبہ کرو۔

﴿ وَوَيۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝۶ ﴾ ’’اور بڑی تباہی اور ہلاکت ہو گی مشرکین کے لیے۔‘‘

آیت ۷ ﴿ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ ﴾ ’’وہ لوگ جو خود کو پاک کرنے کی کوشش نہیں کرتے‘‘

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حضور ﷺ کے مکی دور میں زکوٰۃ کا کوئی نظام نہیں تھا۔ یہ نظام تو ہجرت کے بعد مدینہ میں جا کر قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اگر لفظ زکوٰۃ مکی سورتوں میں آئے تو اس کے لغوی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی چونکہ پاکیزگی کے ہیں اس لیے اس جملے کا مفہوم یہی ہو گا کہ جو لوگ اپنے تزکیۂ نفس کی کوشش نہیں کرتے۔

﴿ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۷ ﴾ ’’اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔‘‘

آیت ۸ ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۸ ﴾ ’’بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے‘ ان کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہو گا۔‘‘

آیت ۹ ﴿ قُلۡ اَئِنَّكُمۡ لَتَكۡفُرُوۡنَ بِالَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ ﴾

’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے کہ کیا تم لوگ کفر کر رہے ہو اس ہستی کا جس نے زمین کو بنایا دو دنوں میں؟‘‘

﴿ وَتَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۹ ﴾ ’’اور تم اس کے لیے مدمقابل ٹھہرا رہے ہو! وہ ہے تمام جہانوں کا رب۔‘‘

اَنۡدَاد کا واحد ’’نِدّ‘‘ ہے جس کے معنی مدمقابل کے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے زمین کو

پیدا کیا ہے تو اس کا مالک اور اصل حاکم بھی وہی ہے۔ لہٰذا دنیا میں اگر کوئی حاکم بنے گا تو اسے اللہ کا تابع اور ماتحت بن کر رہنا ہوگا۔ اس حیثیت سے وہ اللہ کا خلیفہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر حاکم بن بیٹھے اور خود کو مطلق اقتدار (sovereignty) کا حق دار سمجھنے لگے تو وہ گویا اللہ کا مدمقابل ہے‘ چاہے وہ ایک فرد ہو یا کسی ملک کے کروڑوں عوام ہوں۔

آیت ۱۰ ﴿وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا﴾ ’’اور اس میں اس نے بنائے پہاڑوں کے لنگر اس کے اوپر سے‘‘

﴿وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ﴾ ’’اور اس میں برکات پیدا کیں اور اس میں اندازے مقرر کیے اس کی غذاؤں کے‘ چار دنوں میں۔‘‘

یعنی دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا جو بذاتِ خود ایک بہت بڑی تخلیق ہے‘ پھر مزید دو دنوں میں اس کے اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور زمین کی مٹی کو روئیدگی کے قابل بنایا۔ زمین ابتدا میں تو آگ کے ایک کُرّے کی شکل میں تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوئی۔ پہلے پہل اس کی مٹی میں صرف inorganic compounds پائے جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے organic compounds پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اس میں وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا ہوئی کہ یہ زندگی کا گہوارہ بن سکے۔ یہ سارا عمل چار دنوں میں مکمل ہوا۔ یہ آیت تا حال آیاتِ متشابہات میں سے ہے‘ ابھی تک ہم ان چار دنوں کی حقیقت اور تفصیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

﴿سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ﴾ ’’تمام سائلین کے لیے برابر۔‘‘

زمین کی مختلف صلاحیتوں‘ اس کی پیداوار اور اس کے غذائی ذخائر پر ان سب کا حق برابر ہے جنہیں ان کی ضرورت ہے۔ اس میں کسی کے لیے کوئی خاص حصہ نہیں رکھا گیا۔

آیت ۱۱ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ ’’پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا‘ اور ابھی وہ ایک دھواں سا تھا‘‘

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آسمان ایک دھوئیں کی شکل میں تھا اور ابھی سات آسمانوں کی الگ الگ صورتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے سے متعلق کچھ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سائنسی شواہد کے مطابق Big Bang کے بعد

آگ کا ایک بہت ہی بڑا گولا وجود میں آیا۔ پھر اس گولے میں مزید دھماکے ہوئے اور اس طرح اس مادے کے جو حصے علیحدہ ہوئے ان سے کہکشائیں بننا شروع ہوئیں۔

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾ ’’تو اُس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں چلے آؤ خوشی سے یا جبراً!‘‘

﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ ’’ان دونوں نے کہا کہ ہم حاضر ہیں پوری آمادگی کے ساتھ۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ ’’پھر اُس نے ان کو سات آسمانوں کی شکل دے دی‘ دو دنوں میں۔‘‘

قرآن حکیم میں سات مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی‘ لیکن یہ قرآن کا واحد مقام ہے جہاں نہ صرف ان چھ دنوں کی مزید تفصیل (break up) دی گئی ہے بلکہ اس تخلیقی عمل کی ترتیب (sequence) کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یعنی پہلے زمین بنی اور سات آسمان اس کے بعد وجود میں آئے۔ لیکن ابھی تک ہم نہ تو مذکورہ چھ دنوں کے مفہوم کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی زمین و آسمان کے تخلیقی عمل کی ترتیب سے متعلق سائنٹیفک انداز میں کچھ جان سکتے ہیں۔ بہرحال ہمارا ایمان ہے کہ مستقبل میں کسی وقت سائنس ضرور ان معلومات تک رسائی حاصل کرے گی اور انسان اس حقیقت کی تہہ تک ضرور پہنچ جائے گا کہ زمین و آسمان کے وجود میں آنے کی صحیح ترتیب وہی ہے جو قرآن نے بیان فرمائی ہے۔

﴿وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ ’’اور اس نے وحی کر دیا ہر آسمان پر اس کا حکم‘‘

سات آسمان بنانے کے بعد ہر آسمان پر اس سے متعلق تفصیلی احکامات بھیج دیے گئے۔

﴿وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا﴾ ’’اور ہم نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں سے مزیّن کر دیا اور اس کی خوب حفاظت کی۔‘‘

چراغوں سے مراد ستارے ہیں۔ ستارے زمین سے قریب ترین آسمان کے لیے باعث زینت بھی ہیں اور شیاطین جن کی سرگرمیوں کے خلاف حفاظتی چوکیوں کا کام بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شیاطین جن غیب کی خبریں حاصل کرنے کے لیے ممنوعہ حدود میں داخل ہونے کی کوشش

کرتے ہیں ان پر ان ستاروں سے میزائل داغے جاتے ہیں۔ (اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ الحجر کی آیت ۱۷ اور سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۲ کی تشریح۔)

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۱۲﴾ ’’یہ اُس ہستی کا بنایا ہوا اندازہ ہے جو زبردست ہے اور کُل علم رکھنے والا ہے۔‘‘

آیات ۱۳ تا ۲۵

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ اِذْ
جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا
لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَاَمَّا عَادٌ
فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ
اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ
فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى
النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ
وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا
اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ۝ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ
وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَذٰلِكُمْ
ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا
فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ۝ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ
قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

آیت ۱۳ ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝۱۳﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے ایک ایسی خوفناک کڑک سے جیسی کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود کی کڑک تھی۔‘‘

میں نے تو تم لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ جیسے قومِ عاد اور قومِ ثمود پر عذاب آیا تھا‘ تمہاری تکذیب کے باعث ویسا ہی کوئی عذاب تم پر بھی ٹوٹ سکتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ﴾ ’’جبکہ ان کے پاس رسولؑ آئے ان کے سامنے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی‘‘

یہاں پر قومِ عاد اور قومِ ثمود کا ذکر کر کے عرب کا وہ پورا علاقہ مراد لیا گیا ہے جہاں مختلف قوموں کی طرف پے در پے پیغمبر آئے۔ ان پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر قرآن میں بہت تکرار سے آیا ہے۔

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ﴾ ’’(اس دعوت کے ساتھ) کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔‘‘

﴿قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً﴾ ’’(جواب میں ہر قوم کے) لوگوں نے یہی کہا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتوں کو نازل کر دیتا‘‘

﴿فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۱۴﴾ ’’پس جو چیز دے کر آپ بھیجے گئے ہیں ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔‘‘

آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کو اللہ نے کوئی خاص پیغام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے تو آپ اس حوالے سے ہمارا جواب بھی سن لیں اور وہ یہ کہ آپ کے دعوے کے مطابق جس چیز کے ساتھ بھی آپ کو بھیجا گیا ہے ہم اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ ’’عاد کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے زمین میں بہت تکبّر کیا بالکل ناحق‘‘

﴿وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ﴾ ’’اور انہوں نے کہا کہ کون ہے ہم سے بڑھ کر قوت میں؟‘‘

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ﴾ ’’کیا انہوں نے غور

نہیں کیا تھا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے بہت بڑھ کر ہے قوت میں!''

اگر انہیں اپنے مدمقابل کوئی اور قوم اس وقت دنیا میں نظر نہیں آ رہی تھی تو کیا انہیں اللہ کی طاقت بھی نظر نہیں آ رہی تھی؟ ایک وہ طاقتور ہستی تو بہرحال موجود تھی جس نے انہیں پیدا کیا تھا۔

﴿وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿١٥﴾﴾ ''اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

آیت ۱۶ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ ''تو ہم نے ان پر چھوڑ دی بہت زور کی ہوا نحوست کے دنوں میں''

سورۃ الحاقہ میں تند و تیز ہوا کے اس عذاب کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ﴾ (آیت ۶) یعنی انتہائی تیز اور شدید ہوا کا یہ جھکڑ ان لوگوں پر سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتا رہا۔

﴿لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ﴾ ''تاکہ ہم انہیں مزہ چکھائیں رسوا کن عذاب کا اس دنیا کی زندگی میں۔''

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١٦﴾﴾ ''اور آخرت کا عذاب تو کہیں زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ﴾ ''اور جو قومِ ثمود تھی ان کو ہم نے ہدایت کی راہ دکھائی''

ان کی طرف ہم نے اپنا رسول بھی بھیجا اور اونٹنی کی صورت میں انہیں واضح معجزہ بھی دکھا دیا۔

﴿فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ ''لیکن انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کو ہی پسند کیا''

ہماری واضح تعلیمات ان تک پہنچ گئی تھیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند ہی رکھیں۔

﴿فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٧﴾﴾ ''تو انہیں بھی آ پکڑا ذلت کے عذاب کی ہولناک کڑک نے ان کے کرتوتوں کی پاداش میں۔''

آیت ۱۸ ﴿وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ ''اور ہم نے نجات دے دی ان کو جو (ان میں سے) ایمان لائے تھے اور جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاۗءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾﴾ ''اور جس دن

اللہ کے یہ دشمن جمع کیے جائیں گے آگ کی طرف تو ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔''

ظاہر ہے کردار و اعمال کے حوالے سے اہل جہنم سب برابر نہیں ہوں گے۔ ہر مجرم کا عذاب اس کے جرم کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ وہاں جرائم اور سزاؤں کی اقسام کے مطابق اہلِ جہنم کو الگ الگ جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿حَتّٰٓى اِذَا مَا جَاۗءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾﴾ ''یہاں تک کہ جب یہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس بارے میں جو کچھ کہ وہ کرتے رہے تھے۔''

''شہادت'' کے بارے میں یہ بات بتکرار و اعادہ بیان کی جا چکی ہے کہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے اور کسی کے حق میں۔ چنانچہ شَهِدَ کے بعد اگر عَلٰی کا صلہ ہو تو اس کے معنی کسی کے خلاف گواہی دینے کے ہوں گے (جیسا کہ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے) جبکہ شَهِدَ کے ساتھ ''ل'' کا صلہ آنے کی صورت میں کسی کے حق میں گواہی کا مفہوم نکلے گا۔ مثلاً: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ﴾ (المائدہ:۸) اور ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)۔ ان دونوں آیات میں لفظ اللہ کے ساتھ ''ل'' اللہ کے لیے گواہی کا مفہوم دے رہا ہے، کہ تم لوگ اللہ کے لیے کھڑے ہو کر گواہی دینے والے بن جاؤ! بقول اقبالؔ: ع

''دے تو بھی محمد ﷺ کی صداقت کی گواہی!''

آیت ۲۱ ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ﴾ ''اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے کہ تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی؟''

﴿قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ ''وہ کہیں گی کہ ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو قوتِ گویائی عطا کی ہے''

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کے حسب حال ''زبان'' عطا کر رکھی ہے جس سے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے یہ الفاظ اس حوالے سے بہت واضح ہیں: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۴۴) ''اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ لیکن تم لوگ نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔''

﴿وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ ''اور اُسی نے تمہیں پیدا کیا پہلی مرتبہ اور اُسی کی طرف تم لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۲۲ ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ﴾ ''اور تم (اس خیال سے) پردہ داری نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف گواہی دیں گے تمہارے اپنے کان' تمہاری اپنی آنکھیں اور تمہاری اپنی کھالیں''

انسان دنیا میں جرائم کرتے ہوئے لوگوں سے چھپنے کی کوشش کرتا ہے' مگر خود اپنے ہی اَعضاء و جوارح سے کیونکر چھپ سکتا ہے؟

﴿وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ''بلکہ تمہیں تو یہ گمان ہو گیا تھا کہ بہت سی باتیں تو اللہ کے علم میں ہی نہیں ہیں جو تم کر رہے ہو۔''

گویا ایسے جہلاء بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے کرتوتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو کچھ معلوم نہیں۔ قبل ازیں اس حوالے سے مشائین (ارسطو اور اس کے پیروکاروں) کا ذکر بھی گزر چکا ہے جن کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ عالم کلیات ہے' وہ جزئیات کا عالم نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی اشیاء کے متعلق قوانین بنا دیے ہیں اور وہ انہی قوانین کو جانتا ہے' جبکہ ان قوانین کے تحت رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی جزئیات سے اسے کوئی سروکار نہیں — اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ!

آیت ۲۳ ﴿وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ﴾ ''اور تمہارا یہی وہ گمان ہے جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا تھا' جس نے تمہیں غارت کیا ہے''

اس حوالے سے ہمیں خود اپنے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ایک ایک حرکت کو دیکھتا اور جانتا ہے لیکن اپنے اس ایمان کے مطابق ہمارے دلوں میں اس بارے میں یقین پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غلط کام کرتے ہوئے اس حقیقت سے لاپرواہی برت جاتے ہیں کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے' ورنہ اگر واقعی کسی کے دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے تو بھلا وہ کوئی غلط حرکت کیسے کر سکتا ہے۔

﴿فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ''تو آج تم ہو گئے خسارہ پانے والوں میں۔''

آیت ۲۴ ﴿فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ﴾ ''تو اب اگر یہ لوگ صبر کریں (یا نہ

کریں) پس ان کا ٹھکانہ آگ ہی ہے۔''

﴿وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور اگر وہ معافی مانگیں تو اب انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔''

قیامت کے دن وہ چاہیں گے کہ انہیں معافی مانگنے پر چھوڑ دیا جائے مگر اس وقت یہ ممکن نہیں ہوگا۔ معافی مانگنے اور استغفار کرنے کا موقع تو دنیا میں ہے۔ انفرادی طور پر ہر آدمی کی موت کے وقت تک اور اجتماعی طور پر قیامت کے آثار نمایاں ہونے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے' لیکن اس کے بعد عالَم برزخ یا عالَم آخرت میں توبہ کا کوئی سوال نہیں۔

آیت ۲۵ ﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ ''اور ہم نے ان کے لیے ایسے ساتھی مقرر کر دیے جنہوں نے ان کو مزیّن کر کے دکھلائی ہر وہ چیز جو ان کے سامنے تھی اور جو ان کے پیچھے تھی''

جیسے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں ایسے ہی ہر انسان کے ساتھ شیاطین جن بھی لگا دیے گئے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ فرشتوں کی موجودگی کا ذکر قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۶۱ میں ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ﴾ کے الفاظ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے انسانوں کی حفاظت کا انتظام فرماتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے (کراماً کاتبین) اس کے اعمال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ ان فرشتوں کا ذکر سورۃ الانفطار میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿٩﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١١﴾﴾ اسی طرح انسانوں کے ساتھ شیاطین جن بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک ساتھی جنّات (شیاطین) میں سے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر نہ کر دیا گیا ہو''۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِيَّايَ، لٰكِنْ اَعَانَنِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ)) (۱) ''ہاں! میرے ساتھ بھی (ایک شیطان ہے) مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر نصرت عطا فرمائی ہے اور میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔''

(۱) مختصر المقاصد للزرقانی' ح ۹۰۵۔

(باقی صفحہ 45 پر)

رسول اللہ ﷺ کی مستقل سُنّت:
دعوتِ دین

انجینئر نعمان اختر ☆

اگر میں اپنے موضوع کی تمہید ایک سوال سے باندھوں کہ وہ کیا عمل ہے جو فریضۂ رسالت بھی ہے' خیر امت کی نشانی بھی' عظیم خسارے سے بچنے کی شرطِ لازم بھی' دنیوی عذاب سے بچنے کا ذریعہ بھی' اُمّتِ مُسلمہ کا فرضِ منصبی بھی اور رسول اللہ ﷺ کی مستقل اور مؤکّد ترین سنت بھی' تو جواب ایک ہی ہوگا کہ دعوتِ دین کی سنت۔ ان شاء اللہ تذکیر و یاد دہانی کے طور پر اس تحریر میں اس موضوع کی اہمیت' فضیلت' آدابِ دعوت' اس کام کے دوران آنے والی مشکلات اور تنظیم اسلامی کی اس فریضہ کی ادائیگی میں معاونت کو سمجھیں گے۔

امت کی زندگی میں دعوتِ دین کے کام کی وہی اہمیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی حیثیت ہے۔ انسانی جسم اسی وقت تک کارآمد ہے جب تک کہ اس میں دھڑکنے والا دل موجود ہو۔ اگر دل دھڑکنا بند کر دے تو پھر انسانی جسم مٹی کا ڈھیر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کام میں بڑی کمزوری' تساہل بھی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فکر اور جذبہ ماند پڑ جاتا ہے' اہمیت و فضیلت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ دعوت دین کی اہمیت کے ذیل میں چند نکات پیشِ خدمت ہیں:

دعوتِ دین کی اہمیت

۱۔ قرآن حکیم نے دعوتِ دین کو عظیم خسارے سے بچنے کی لازمی شرط قرار دیا ہے۔ سورۃ العصر کی دوسری آیت میں انسانی المیہ کا بیان ہے کہ تمام انسان واقعی خسارے میں ہیں اور اگلی آیت

☆ امیر حلقہ کراچی جنوبی

میں اس خسارے سے بچنے کی چار لازمی شرائط میں تواصی بالحق کو بھی شرط کے طور پر بیان کیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾

''تیزی سے گزرتے ہوئے زمانے کی قسم' انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے' اور نیک اعمال کرتے رہے' اور باہم مل کر ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

۲۔ سورۂ یوسفؑ میں دعوت دین کو نبی اکرم ﷺ کا راستہ اور مستقل عمل قرار دیا گیا ہے یعنی ۲۳ برس کی مستقل سنت جس کے ذریعہ آپ ﷺ نے انسانیت پر حجت تمام کی۔

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ﴾

(یوسف:۱۰۸)

''(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی علیٰ وجہ البصیرت یہ کام کر رہا ہوں اور (وہ بھی) جس نے میری اتباع کی۔''

۳۔ دعوتِ دین کا عمل ختم نبوت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ ختم نبوت کے بعد انسانیت کی صلاح و فلاح بذریعہ قرآن و سنت اب امت کی ذمہ داری ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری یہ فرما کر امت کو منتقل فرمائی کہ ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))(صحیح بخاری) ''تم میں سے جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں''۔ یعنی اب جس نے بھی دین اسلام کی گواہی دی اس کی ذمہ داریوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کے دین کو انسانیت تک اپنی وسعت و صلاحیت کے مطابق پہنچائے۔

۴۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ میں سے ایک وصف داعی الی اللہ ہونا بیان کیا ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝۴۵ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝۴۶﴾

''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور خبردار

کرنے والا بنا کر‘ اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے انسان کے لیے اس مرتبے سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں کہ وہ داعیاً الی اللہ اور سراجاً منیرا سے کسبِ نور کر کے خود بھی ہدایت کا ایک چھوٹا چراغ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

۵۔ سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ نے نیکی کا حکم اور برائی سے روکنے کے عمل کو اہل ایمان کی دوستی کا مظہر بھی ٹھہرایا ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

’’مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں‘ یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں‘ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔‘‘

۶۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان مبارک کے مطابق دعوت دین اللہ کے عذاب سے بچنے اور دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ))(سنن الترمذی)

’’قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے‘ نیک کاموں کا حکم کیا کرو اور برے کاموں سے روکا کرو‘ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسا عذاب نازل کرے کہ پھر تم اس سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔‘‘

۷۔ دعوتِ دین کے ذریعے اسلام کو بڑی کارآمد شخصیات ملتی ہیں۔ یہ دعوت کا ثمرہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ’’صدیق‘‘ کے درجے کو پہنچے‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ’’فاروق‘‘ قرار پائے‘ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ’’غنی‘‘ کا لقب حاصل ہوا‘ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ’’اسد اللہ و اسد الرسول ﷺ‘‘ ہوئے‘ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ’’سیف من سیوف اللہ‘‘ کے لقب سے سرفراز ہوئے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ’’المقری‘‘ کے نام سے مشہور ہوئے۔

۸۔ اسی طرح محبتِ رسول ﷺ کا اصل تقاضا آپ ﷺ کی سنتِ دعوت کا اتباع ہے۔ یہی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جن کی اتباعِ سنت کی بدولت چھ جلیل القدر ایسے صحابہ ایمان لائے جن کو دنیا میں جنت کی بشارت ملی۔ یہی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں جن کی ایک سال کی محنتِ دعوت سے ۷۵ افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

۹۔ دعوتِ دین کے بغیر انفرادی نیکی قابلِ قبول نہیں‘ بلکہ قابلِ سزا جرم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَائِيْلَ عليه السلام اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا، قَالَ فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ فَقَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ، فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ (رواه البیهقی)

’’اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ فلاں شہر کو الٹ دو اس کے باشندوں سمیت‘ پس جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: باری تعالیٰ! بے شک اس میں تیرا فلاں بندہ ہے جس نے کبھی آنکھ جھپکنے کے برابر بھی تیری نافرمانی نہیں کی! تو ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ اس شہر کو الٹ دو‘ اس نیک بندے پر اور ان لوگوں پر‘ کیوں کہ میری خاطر (یعنی میری نافرمانیوں اور کھلے عام گناہوں کو دیکھ کر) کبھی اس کے چہرے کا رنگ بھی نہیں بدلا۔‘‘

۱۰۔ دعوتِ دین چھوڑنے سے امت وحی کی برکات سے محروم کر دی جاتی ہے۔ ترمذی شریف میں نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

’’جب میری امت دنیا کی قدر بڑھا لے گی تو اس سے اسلام کی ہیبت چھین لی جائے گی‘ اور جب امت امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی‘ اور جب امت آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔‘‘

۱۱۔ دعوت دین امت کو بربادی سے بچانے کا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے ساتھیوں کو نہی عن المنکر کی اہمیت ایک مثال دے کر سمجھائی۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْقَائِمِ عَلٰى حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا، كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوْا عَلٰى سَفِيْنَةٍ، فَاَصَابَ بَعْضُهُمْ اَعْلَاهَا وَبَعْضُهُمْ اَسْفَلَهَا، فَكَانَ الَّذِيْنَ فِى

أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَاءِ مَرُّوا عَلَى مَنْ فَوْقَهُمْ، فَقَالُوا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِي نَصِيبِنَا خَرْقًا وَلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ تَرَكُوهُمْ وَمَا أَرَادُوا هَلَكُوا جَمِيعًا، وَإِنْ أَخَذُوا عَلَى أَيْدِيهِمْ نَجَوْا، وَنَجَوْا جَمِيعًا))(صحيح البخاري

''اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور اس میں گھس جانے والے (یعنی خلاف کرنے والے) کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جنہوں نے ایک کشتی کے سلسلے میں قرعہ ڈالا' جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں کو کشتی کے اوپر کا حصہ اور بعض کو نیچے کا حصہ ملا۔ پس جو لوگ نیچے والے تھے' انہیں پانی لینے کے لیے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اپنے ہی حصہ میں ایک سوراخ کرلیں تاکہ اوپر والوں کو ہم کوئی تکلیف نہ دیں۔ اب اگر اوپر والے بھی نیچے والوں کو من مانی کرنے دیں گے تو کشتی والے تمام ہلاک ہوجائیں گے' اور اگر اوپر والے نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں تو یہ خود بھی بچیں گے اور ساری کشتی بھی بچ جائے گی۔''

سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ یعنی اصحابِ سبت کا واقعہ بیان ہوا جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچتے وہی ہیں جو دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔

دعوتِ دین کی فضیلت: قرآن حکیم کی روشنی میں

۱۔ قرآن مجید دعوت دین کے عمل کو بہترین بات قرار دیتا ہے۔ سورۂ حم السجدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾﴾

''اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔''

۲۔ قرآن مجید دعوتِ دین کے عمل کو بہترین امت کی نشانی قرار دیتا ہے۔ سورہ آل عمران میں ربِ کائنات کا ارشاد ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط﴾ (آیت: ۱۱۰)

''تم بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

۳۔ قرآن مجید دعوتِ دین کے عمل کو معتدل امت کی نشانی بھی قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں رب کائنات کا ارشاد ہے کہ

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (آیت: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

دعوتِ دین کی فضیلت: احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

۱۔ داعیٔ دین خیر کی تعلیم دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ' فرشتوں اور تمام مخلوقات کی دعا کا مستحق ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ))(سنن الترمذی)

''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے' زمین و آسمان کی تمام مخلوقات حتیٰ کہ چیونٹیاں اپنے گھروں میں اور سمندر میں مچھلیاں لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لیے دعا کرتے ہیں۔''

۲۔ داعیٔ دین نبی اکرم ﷺ کی قیمتی دعا کا بھی مستحق ہوتا ہے:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ))(سنن الترمذی)

''اللہ اس بندے کو سرسبز وشاداب رکھے جو مجھ سے کوئی بات سنے اور یاد کرے' پھر من وعن دوسروں تک پہنچادے۔''(ترمذی)

۳۔ داعیٔ دین نبی کریم ﷺ کا معاون و مددگار ہونے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں آپ ﷺ کا قول مبارک ہے: ((بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً)) ''پہنچاؤ میری طرف سے خواہ ایک ہی آیت ہو۔''

۴۔ داعیٔ دین کو ہدایت کی پیروی کرنے والے کے برابر اجر ملتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذَالِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا))

''جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی اس کے لیے اس ہدایت کی پیروی کرنے والے کے برابر اجر ہے' بغیر عمل کرنے والے کے عمل میں کمی کیے ہوئے۔''

۵۔ دعوتِ دین ایک قیمتی دولت بھی ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کندھا پکڑ کر ارشاد فرمایا:

((فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ))

(متفقٌ علیہ)

''اللہ کی قسم اگر تمہارے ذریعے سے اللہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں (کی دولت) سے بہتر ہے۔''

۶۔ دعوتِ دین کے دوران جسم پر لگنے والا غبار جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ معجم طبرانی ومسند احمد کی روایت میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ))

''جس بندے کے بھی قدم اللہ کے راستے میں غبار آلود ہوگئے' انہیں (جہنم کی) آگ چھوئے؟ (یہ ناممکن ہے!)''

۷۔ داعیٔ قرآن کے لیے ہدایت کی بشارت ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

((مَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ)) (سنن الترمذی)

''جو اس قرآن کی طرف دعوت دے تو اس کو ہدایت ہوگئی سیدھے راستے کی طرف۔''

۸۔ داعیٔ دین اللہ کی رضا وخوشنودی کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ ''آدمی کوئی کلمہ خیر اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اُس کی قدر ومنزلت کا اُسے علم نہیں ہوتا' لیکن اللہ اُس کے سبب اُس کے لیے اپنی رضا وخوشنودی اُس دن تک کے لیے لازم کر لیتا ہے جب کہ وہ اُس سے ملاقات کرے گا۔''

دعوتِ دین کی اہمیت: تنظیمِ اسلامی کے لٹریچر میں

☆ ''قراردادِ تاسیس''، جس کو تنظیم اسلامی کی اساسی فکر اور رہنما اصولوں کی حیثیت حاصل ہے' اس میں دعوتِ دین کے ضمن میں جو درج ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عامۃ الناس کو دین کی دعوت وتبلیغ کی جو ذمہ داری اُمت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اس کے ضمن میں اہم ترین کام یہ ہے کہ:

☆ جاہلیت قدیمہ کے باطل عقائد ورسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے۔

☆ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتاب وسنت کی ہدایت ورہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

☆ دعوت کا اصل محرک ''الدین النصیحۃ'' کے نبوی ﷺ فرمان کے مطابق انسانی ہمدردی اور نصح وخیر خواہی کا جذبہ ہو۔

☆ ''الاقرب فالاقرب'' کے اصول کے تحت داعی کو جس سے جتنی قربت اور محبت ہو' دعوت میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ''دعوت الی اللہ کی ضرورت واہمیت اور اس کے اصول ومبادی'' کے موضوع پر یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ایک خطاب کیا جس کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس میں بانی تنظیم نے دعوتِ دین کے فرضِ منصبی کی اہمیت' اس کی اساسات' مدارج ومراحل' شرائط واہداف کو بہت خوبی سے واضح فرمایا۔

☆ اسی طرح رفقاء تنظیم کی انفرادی دعوت کے عمل کو زیادہ منظم اور مؤثر بنانے کی غرض سے انفرادی دعوت کا پورا نظام مرتب کیا گیا ہے۔

☆ اس پر مستزاد حلقہ ہائے قرآنی' رجوع الی القرآن کورسز' رمضان المبارک کی راتوں میں دورۂ ترجمہ قرآن کی نشستیں اور آگاہی منکرات مہمات بھی دعوت دین کے اس عمل میں اہم سنگ ہائے میل ہیں۔

دعوتِ دین کے دوران آنے والی مشکلات

چونکہ حق کڑوا ہوتا ہے' لہٰذا جب بھی دعوتِ حق معاشرے میں بلند ہوتی ہے تو باطل نظام

کی طرف سے دعوتِ حق کے خلاف مختلف محاذ کھولے جاتے ہیں۔ زبانی اذیت بھی دی جاتی ہے' نفسیاتی طور پر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور آپ جا کر کہتے ہو کہ داڑھی رکھ لو اور پردہ کر لو؟ بھوکے کو تو روٹی چاہیے اور بس! رحمی رشتے منقطع ہو جاتے ہیں' قبیلہ ناراض ہو جاتا ہے' جگری دوست مذاق اڑاتے ہیں' خدائی فوج دار کا لقب دیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو بھی دعوت کے مرحلے میں ساحر' کذاب' شاعر و مجنون جیسے طنز کے تیر سہنے پڑے' آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بیوقوف کہا گیا۔ معاذ اللہ!

اس ماحول میں داعیٔ دین کو بیدار مغز بھی ہونا چاہیے جو اس قسم کی چالاکیوں کا مسکت جواب دے سکے اور متحمل مزاج ہونا بھی ضروری ہے جو ایسی باتیں سن کر طیش میں نہ آئے' بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر مؤثر انداز میں اپنی بات پہنچا سکے۔

جب داعیانِ حق زبانی اذیت کو جھیلتے ہوئے دعوتی عمل جاری رکھتے ہیں تو نظام باطل کا اگلا وار جسمانی تشدد ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اس راہ میں جسمانی تشدد سہا ہے۔ عقبہ بن اُبی معیط رسولِ مکرم ﷺ کی گردن میں چادر ڈال کر کھینچتا تھا' حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں ام کلثوم و رقیہ رضی اللہ عنہما کو طلاق دی گئی' طائف سے واپسی پر پتھر مار مار کر آپ ﷺ کو لہولہان کیا گیا۔ آپ ﷺ کس قدر دل فگار تھے اور آپ ﷺ کے احساسات پر حزن و الم اور غم و افسوس کا کس قدر غلبہ تھا' واقعہ یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ سختی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ ان لم یکن بك علی غضب فلا ابالی ''اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں''

یعنی داعی دین اللہ کی رضا کے لیے اس راہ میں آنے والی ساری تکالیف جھیل جاتا ہے۔

مزید آپ ﷺ نے ربِ کائنات کے حضور التجا کی کہ

''لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادہ ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہو گئیں اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملات

درست ہوئے کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے' یا تیرا عتاب مجھ پر وارد ہو۔ تیری ہی رضا مطلوب ہے' یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔''

آپ ﷺ کو اس راہ میں ہجرت بھی کرنی پڑی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر تم مجھے اور رسول اللہ ﷺ کو اس وقت دیکھتیں جب ہم غار ثور پر چڑھے تھے (تو عجب منظر دیکھتیں) حضور ﷺ کے دونوں قدموں سے خون ٹپک رہا تھا (ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے) اور میرے دونوں پاؤں سن ہو کر پتھرا گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے خوب مارا بھی اور پاؤں تلے روندا بھی۔ عتبہ بن ربیعہ قریب آ کر تلوے والے جوتوں کو ٹیڑھا کر کے چہرے پر مارتا اور پیٹ پر کودتا بھی تھا۔ دن کے آخر میں ہوش آیا تو صرف اتنا پوچھا کہ حضور ﷺ کی کیا کیفیت ہے؟ یہ تھے آپ ﷺ کے یارِ غار جو آپ ﷺ سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔

آدابِ دعوتِ دین

دعوتِ دین کے ضمن میں داعیٔ دین کو درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ نیت میں اخلاص: تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اخلاص سے پُر تھی۔ قرآن مجید میں بارہا اس کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے:

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾﴾

(الشعراء)

''میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔''

۲۔ اللہ کی ربوبیت پر اعتماد: دعوت الی اللہ کے منصب پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو اللہ ربّ العزت کی ربوبیت پر پوری طرح مطمئن و قائم ہو۔

۳۔ ذمہ داری کا احساس: یہ فریضۂ رسالت کے احساس کی شدت تھی کہ نبی کریم ﷺ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تلاوت سنتے ہوئے اس آیت پر زار و قطار روئے کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾﴾ (النساء)

''پھر سوچیں کہ اُس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر آپ (ﷺ) کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔''

۴۔ عزم مصمّم: مکّی دور میں جب سردارانِ قریش نے ابو طالب سے اپنے بھتیجے کو دعوت سے باز آنے کا کہا تو ابو طالب کے استفسار پر آپ ﷺ نے پورے استقلال سے فرمایا کہ ''اگر یہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس دعوت سے پیچھے نہ ہٹوں گا۔''

۵۔ اصل محرک: دعوت دین کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے داعیٔ دین کے اندر اصل محرک انسانی ہمدردی ہو۔ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے:

''لوگو! تم آگ کے گھڑے کے کنارے ہو اور آگ میں گرا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمروں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں بچا رہا ہوں۔''

۶۔ دعوتی عمل میں تدریج: دعوت دین کا کام ''الاقرب فالاقرب'' یعنی جو جتنا قریب ہے وہ زیادہ حق دار ہے' کے اصول کے مطابق آگے بڑھے گا۔ چنانچہ اس کا آغاز نفس سے ہو کر اپنے قرابت دار' محلّہ دار اور پھر پوری انسانیت تک منتج ہوگا۔

۷۔ دعوت دین کا ہدف: داعیٔ دین کے سامنے دعوت کا ٹارگٹ یہ ہو کہ انفرادی اعتبار سے تزکیۂ نفس کا حصول یعنی نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنّہ تک کا سفر اور اجتماعی اعتبار سے اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعہ اللہ کی زمین پر اللہ کے عادلانہ نظام کا نفاذ ہو جائے۔ جس کا آغاز یقیناً کسی ایک خطہ یا ملک سے ہوگا اور پھر اس کی برکات سے پوری انسانیت مستفید ہوگی اور نتیجتاً پوری دنیا میں رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم و دائم ہوگا اور نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوگی:

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ ، فَرَاَیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُهَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْهَا)) (صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا) تو میں نے اس کے تمام مشرق اور تمام مغرب دیکھ لیے۔ اور سن رکھو! میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو سکیڑ کر اور لپیٹ کر مجھے دکھا دیے گئے۔''

ایک اور حدیث جو حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس میں حضور ﷺ کے یہ

الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ کَلِمَةَ الْاِسْلَامِ .....)) (مسند احمد)

''اس روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ ہی کمبلوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ بچے گا جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے.....''

بقول اقبال:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

۸۔ دعوت کا ذریعہ: دعوت دین کا بنیادی ذریعہ قرآن حکیم ہو۔ مسلک کی دعوت سے بالاتر ہو کر ہمیں اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن حکیم پر قائم کرنی ہوگی' بقول اقبال:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

۹۔ دعوت و عمل کا تعلق: داعیٔ دین کے لیے اس عمل میں اہم ترین شے اس کے عمل کا دعوت کے مطابق ہونا ہے۔ ورنہ اگر دعوت بلا عمل ہو اور اس کام میں داعیٔ دین جری و پختہ ہو جائے تو اس کا یہ طرزِ عمل دعوتِ دین کے لیے سم قاتل ہے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بقول:

''حقیقت میں عمل صالح ہی وہ مشکل گھاٹی ہے جس سے جی چرا کر لوگوں نے یہ تقسیم کار کی ہے کہ کچھ لوگ اس کی قید سے آزاد ہوں اور حلال و حرام سب ذرائع سے دولت کما کر کچھ لوگوں کو پالیں جو دین کی تبلیغ کا کام کریں۔ ذہانت کا تو یہ یقیناً ایک شاہکار ہے'

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین کے خلاف اس شریفانہ معاہدے سے بڑی سازش شاید کوئی نہ ہو‘‘ (از کتاب ’’دعوت الی اللہ‘‘)

۱۰۔ دعوتی میدان کے دو ہتھیار: داعیٔ دین کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس فریضہ کی اہمیت وحساسیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو دو ہتھیاروں سے مسلح کرنے اور رکھنے کی سعی کرے یعنی علم اور صبر۔

داعیانہ تڑپ

دعوتِ دین پارٹ ٹائم جاب نہیں‘ بلکہ مسلسل عمل کا نام ہے۔ مکہ میں کوئی گھر‘ گلی چوک‘ چوراہا نہیں ہوگا جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت نہ دی ہو۔ آپ ﷺ نے بازاروں میں اور گھروں میں جا جا کر دعوت دی۔ کوئی کاروباری مرکز یا مذہبی اجتماع ایسا نہ ہوگا کہ جس میں آپ ﷺ تشریف نہ لے گئے ہوں۔ شدید مخالفانہ ماحول میں حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں ایک ایک خیمے میں جا کر دعوت دی۔ یہ تھا دعوت کا جنون۔ کسی نے داعیانہ تڑپ کو سمجھانے کے لیے خوب مثال دی کہ دو پرندے محوِ پرواز تھے کہ اچانک ان کے برابر سے ایک جیٹ طیارہ آگ اگلتا ہوا گزرا تو ایک پرندے نے دوسرے سے پوچھا کہ یہ ہم سے آگے کیسے نکل گیا؟ تو دوسرے نے کہا کہ ’’تم دیکھتے نہیں کہ اس میں آگ لگی ہوئی ہے!‘‘ —— بس یہ آگ لگنے کی دیر ہوتی ہے‘ پھر داعیٔ دین پر اس فریضہ کی ادائیگی کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور وہ کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر مکہ میں ہوا کا طوفان اور تیز بارش تھی کہ اسی اثنا میں ابوجہل کے گھر کا دروازہ کھٹکتا ہے۔ ابوجہل سوچتا ہے کہ اس وقت تو کوئی بہت ضرورت مند ہی آسکتا ہے۔ وہ دروازہ کھولتا ہے تو سامنے رحمۃ اللعالمین ﷺ کو داعیانہ تڑپ کے ساتھ موجود پاتا ہے اور غصے سے دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں یہ داعیانہ تڑپ ہمیں بھی عطا فرمائے۔ آمین!

مدعو کے لیے دعا

وہاں اللہ کے رسول ﷺ تو دشمنوں کو جا کر دین کی دعوت دے رہے ہیں اور ان کے لیے ہدایت کی دعا کر رہے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا آج ہمارے ہاتھ کبھی اپنوں کے لیے بھی

اٹھے ہیں؟ کیا ہم نے اپنوں کے لیے دین کی دعوت دینے کا کوئی بندوبست کیا ہے؟

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا جائزہ لیں۔ یہ انہی کی قربانیوں کا اعجاز تھا کہ جزیرہ نمائے عرب سے پھوٹنے والی دعوت نے یکا یک پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس عظیم مقصد کے لیے ہر اس چیز کو قربان کر دیا جو آج ہمیں بے حد عزیز ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اہل وعیال اور کنبے قبیلے والے تھے‘ اُنؓ کے بھی تجارت وکاروبار تھے‘ اُنؓ کی بھی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ کیا ان میں سے کوئی چیز بھی اس عظیم مقصد میں رکاوٹ بنی؟

معاشرے میں دو ہی دعوتیں ہیں: دعوت الی النار یا دعوت الی الجنۃ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ (البقرۃ: ۲۲۱)

’’یہ لوگ (تمہیں) آگ کی طرف بلاتے ہیں‘ اور اللہ اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔‘‘

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا مشن نہ بھولیں‘ فکر کو مضبوط کریں اور اس تناور درخت کے محافظ بنیں جس کا پودا نبی کریم ﷺ نے لگایا تھا۔ پھر اسی کام کا بیڑا آپ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں نے اُٹھایا‘ ہمارے اسلاف نے اس کام کی اہمیت کو اجاگر کیا‘ بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اسی اسلاف کے کام کو زندہ رکھتے ہوئے تنظیم اسلامی کا قیام فرمایا۔ کسی نے بڑی پیاری مثال دی ہے کہ ایک رویہ یہ ہے کہ درخت کے نیچے آکر بیٹھے‘ سایہ لیا‘ پھل کھایا‘ کپڑے جھاڑے اور چل دیے۔ مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ سایہ لیا‘ پھل کھایا اور کلھاڑا لے کر درخت کو کاٹنا شروع کر دیا۔ تیسرا رویہ یہ ہے کہ سایہ اور پھل سے مستفید ہوئے اور جا کر دوسروں کو اس درخت کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ چوتھا رویہ جو کہ احسن ومطلوب ہے کہ درخت کا سایہ لیتے ہیں‘ پھل کھاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس درخت کی حفاظت کرنی چاہیے اس لیے کہ جب یہ درخت مجھے سایہ اور پھل دے رہا ہے تو یہ دوسروں کو بھی دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس روش پر چلتے ہوئے دعوت وایمان کے دیے جلانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ ہمیں چاہیے کہ نامساعد حالات سے مایوس ہو کر وقتی اُبال اور عجلت پسندی سے بچیں۔ اس ظلمتِ شب میں ثابت قدم رہیں۔ امتحانات سے گھبرائیں نہیں۔ بقول رئیس امروہوی:

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے
سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا، غموں سے اندوہ گیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیسؔ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے تھے آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

اللہ ربّ العالمین مجھے اور ہم سب کو نبی کریم ﷺ کی اس مستقل سنت کو اپنا کر جنت میں آپ ﷺ کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

بقیہ: بیان القرآن

یعنی میں نے اسے اپنا تابع بنالیا ہے اور اب وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال اس آیت میں غلط کار انسانوں کے ان شیطان ساتھیوں کا ذکر ہے جو دنیا میں ان کے غلط عقائد اور برے اعمال کو خوش نما بنا کر انہیں دکھاتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ گناہوں کی لذت اور دنیا کی رنگینیوں میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

﴿وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ﴾ ''اور ان پر سچ ثابت ہوئی (اللہ کے عذاب کی) بات، (اور وہ شامل ہو گئے) ان امتوں میں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں جنوں اور انسانوں کی۔''

ان پر بھی بالآخر وہی بات پوری ہو کر رہی جو جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں پر پوری ہوئی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب کے مستحق قرار پائے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۵﴾ ''یقیناً وہ خسارہ پانے والے لوگ تھے۔''

❁❁❁

متاثر کُن داعیانِ اِلی اللہ کی محنت

اور ہماری ذمہ داریاں

انجینئر محمد رشید عمر

دعوتِ دین کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو کہیں کسی دور میں اُمت نے اختیار کیا ہو، بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے پہلے دن سے اس عمل کو ذریعہ بنایا۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو مجنون، ابتر اور ساحر کے القابات سے نوازا۔ یہ اس درجہ کے لوگ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی طرف سے ان کی مذمت کی۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ﴿..... حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳﴾ (القلم) ''.....قسمیں کھانے والا، ذلیل، طعنہ دینے والا، چغل خور، مال میں بخل کرنے والا، حد سے بڑھا ہوا بدکار، سخت خو اور بدذات'' کے ناموں سے پکارا۔ قرآن پاک میں ان کے برے کردار اور سیرتِ سیئہ سے پردہ نہ اٹھایا جاتا تو کسی کو معلوم نہ ہو پاتا کہ کس درجے کے بدترین خلائق کو آپ ﷺ نے دین کی دعوت دی۔ ایسے لوگوں کے مقابلے میں آپ ﷺ نے اعلیٰ اخلاق پر رہتے ہوئے دعوت میں ایسی دل سوزی کا مظاہرہ کیا کہ جس ہستی نے آپؐ کی یہ ذمہ داری لگائی وہ کہہ اٹھا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾ (الشعراء) ''(اے پیغمبر ﷺ) شاید آپ اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اپنے تئیں ہلاک کر دو گے''۔ ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶﴾ (الکہف) ''(اے پیغمبر ﷺ) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے!''

اس کی وجہ اس دعوت کے مبنی برحق ہونے کا یقین تھا۔ اس کے مقابلے میں اُس وقت نظام ہائے زندگی جن نظریات و اعمال پر استوار تھے، ان کے باطل اور بیہودہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ دین برحق کی دعوت آسان اور سریع الفہم دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے تو ان کے دل قبول کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ یہی دھن آپ ﷺ

کے پیروکاروں کے سیرت و کردار میں بھی رواں دواں ہوگئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دین کی دعوت کا کام چھوٹے بڑے‘ امیر غریب‘ تاجر مزدور اور حاکم و محکوم کی زبان کا پسندیدہ کلام بن گیا۔ دن ہو‘ رات ہو‘ سفر ہو‘ حضر ہو‘ دیس ہو‘ پردیس ہو‘ دین کی دعوت میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنتی تھی۔ دین اسلام کی دعوت نے تاریخ انسانی پر کس طرح اثر ڈالا اور کن لوگوں نے یہ کام کیا‘ اس حوالے سے تین اَدوار کا ذکر کیا جاتا ہے۔

متاثر کن دعوت کا پہلا دور

نبی کریم ﷺ نے بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر مدینہ والوں کی درخواست پر سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ دین کی دعوت کے لیے بھیجا۔ انہوں نے قرآن مجید کے ذریعے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی اور وہ مدینہ میں معلّم القرآن اور ’’مقری‘‘ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ان کی ایک سالہ محنت کے نتیجے میں اتنے لوگ ایمان لے آئے جتنے حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سالہ دعوت کے نتیجے میں بھی نہیں لائے تھے۔ یہ لوگ ہجرتِ مدینہ کا ذریعہ بنے اور پھر یہی لوگ نبی کریم ﷺ کی قیادت میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں اور اس کے بعد پوری دنیا میں اسلام کے غلبہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

متاثر کن دعوت کا دوسرا دور

تیرھویں صدی عیسوی میں جب تاتاریوں کے ہاتھوں سلطنتِ عباسیہ تباہ و برباد ہوگئی تو اُس وقت اہل اللہ نے دعوتِ دین کے ذریعے فاتحین کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر اسی صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے!

مثال کے طور پر شیخ جمال الدینؒ اور ان کے بیٹے رشید الدینؒ کی مساعی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چغتائی سلطنت کے زوال کے بعد جس شخص نے ایک الگ مملکت قائم کی تھی‘ اس کا نام توقلق تیمور خان (۱۳۴۷ء تا ۱۳۶۳ء) تھا۔ اس نے بخارا کے ایک بزرگ شیخ جمال الدینؒ کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا تھا۔ کہتے ہیں یہ شیخ چند مسافروں کے ساتھ نادانستہ طور پر توقلق تیمور خان کی شکارگاہ میں داخل ہوگیا۔ خان نے حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر اس کے سامنے حاضر

کیا جائے۔ خان نے غضب ناک ہوکر شیخ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے ہمارے شکار میں خلل ڈالنے کی کیسے جرأت کی؟ شیخ نے جواب دیا: ہم بالکل اجنبی ہیں اور اس بات سے مطلق آگاہ نہ تھے کہ ہم ایک ممنوعہ قطعۂ زمین میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب خان کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اُس نے کہا کہ ایک ایرانی سے تو کُتّا بھی بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے کہا: ’’ہاں یہ سچ ہے۔ اگر ہم دین برحق پر نہ ہوتے تو اس صورت میں ہم یقیناً کتوں سے بھی بدتر تھے‘‘۔ شیخ کے اس جواب سے خان بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ہم شکار سے واپس آئیں تو اس جرأت مند ایرانی کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔ چنانچہ واپسی پر ملاقات ہوئی تو خان نے شیخ کو الگ لے جا کر پوچھا کہ ’’دین برحق کیا چیز ہے‘ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟‘‘ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے عقائد ایسی گرم جوشی اور ایسے دینی ولولے سے بیان کیے کہ خان کا دل جو پہلے پتھر کی طرح سخت تھا موم کی طرح پگھل گیا۔ پھر شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان کو اپنے بے بصیرت اور گمراہ ہونے کا یقین ہوگیا۔ لیکن اُس نے کہا کہ ’’اگر میں اسی وقت دین اسلام کا اظہار کروں تو میں اپنی رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا‘ لہٰذا تم کچھ عرصے کے لیے صبر و تحمل سے کام لو۔ جب میں اپنے باپ دادا کی سلطنت کا مالک بنوں گا تو اُس وقت تم میرے پاس پھر آنا۔‘‘

اس زمانے میں چغتائی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوچکی تھی‘ اور کئی برسوں کے بعد توقلق تیمور تمام سلطنت کو جمع کرنے اور اس پر اپنی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس اثنا میں شیخ جمال الدین اپنے ملک کو واپس جا چکے تھے۔ وطن پہنچ کر وہ سخت بیمار ہوگئے اور جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین کو اپنے پاس بلا کر اس سے کہا کہ توقلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ بننے والا ہے۔ اس وقت اس کے پاس ضرور جانا اور اس کو میرا اسلام پہنچانا اور اسے بے خوف و خطر وہ وعدہ یاد دلانا جو اُس نے مجھ سے کیا تھا۔ چند سال کے بعد جب توقلق تیمور اپنے باپ دادا کا تخت و تاج حاصل کر چکا تو شیخ رشید الدین اُس کے لشکر میں جا پہنچے تاکہ اپنے والد کی وصیت پوری کریں‘ لیکن باوجود اپنی تمام کوششوں کے وہ خان کے دربار میں باریاب نہ ہوسکے۔ آخر کار مجبور ہوکر انہوں نے یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصبح خان کے خیمے کے پاس اذان کہنی شروع کردی۔ اس طرح توقلق خاں کی نیند خراب ہوئی تو اُس نے غضبناک ہوکر شیخ رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا اور شیخ نے حاضر ہوکر اسے اپنے باپ کا پیغام پہنچایا۔ توقلق تیمور کو اپنا وعدہ فراموش نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے

کہا کہ ’’جب سے میں تخت پر بیٹھا ہوں جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ میرے ذہن میں تھا‘ لیکن جس شخص سے میں نے وعدہ کیا تھا‘ وہ پھر کبھی نہ آیا۔ بہرحال اب میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں‘‘۔ اس کے بعد تو قلق خان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف با سلام ہوا۔ اور بقول ابوالغازی ’’اس صبح کو آفتابِ اقبال نے توفیقِ الٰہی کے افق سے طلوع کیا‘ اور کفر کی تاریک رات کافور ہوگئی۔ اس کے بعد خان نے فیصلہ کیا کہ تبلیغ اسلام کے لیے مغل شہزادوں سے فرداً فرداً گفتگو کرنی چاہیے۔ جو لوگ اسلام قبول کریں تو یہ بات ان کے حق میں اچھی ہوگی‘ مگر جو لوگ انکار کریں‘ ان کو کافر اور بُت پرست سمجھ کر قتل کر دینا چاہیے۔‘‘

جس شخص کا سب سے پہلے اظہار لیا گیا وہ میر تولک تھا۔ خان نے اس سے پوچھا ’’کیا تم اسلام قبول کرو گے؟‘‘ اس پر وہ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ ’’تین سال ہوئے جب کاشغر کے چند مقدس آدمیوں نے میرے سامنے اسلام کی تبلیغ کی تھی اور میں مسلمان ہوگیا تھا‘ لیکن تمہارے خوف سے میں نے اس کا اعلان نہیں کیا‘‘۔ پھر تو قلق خان اٹھا اور اس کو گلے لگالیا اور پھر تینوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ اس طرح سے انہوں نے شہزادوں سے یکے بعد دیگرے گفتگو کی اور ان سب نے اسلام قبول کرلیا‘ سوائے ایک شخص کے جس کا نام جراس تھا۔ اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ شیخ اور اس کے ملازم کے درمیان زور آزمائی کا مقابلہ ہونا چاہیے۔ اس کا خادم ایک بڑا قد آور کافر تھا۔ وہ اس قدر طاقت ور تھا کہ دو سال کے اونٹ کو اٹھا سکتا تھا۔ شیخ نے اس مقابلے کو منظور کرلیا اور اس سے کہا کہ ’’اگر میں تمہارے خادم کو گرا نہ سکا تو میں تمہیں مسلمان ہونے کے لیے نہ کہوں گا۔ اگر خدا کی یہ مرضی ہے کہ مغل لوگ مشرف با سلام ہوں تو بے شک اس آدمی کو مغلوب کرنے کے لیے مجھے کافی طاقت بخشے گا‘‘۔ تو قلق خان اور دوسرے مسلمانوں نے شیخ کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی لیکن شیخ اپنے ارادے میں پختہ رہے۔ ایک انبوہ کثیر جمع ہوگیا اور کافر کو اندر لے آئے‘ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ کافر‘ جسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا‘ بڑے پُرغرور انداز میں آگے بڑھا۔ شیخ اس کے سامنے بہت چھوٹے اور کمزور دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے تو شیخ نے اس کافر کی چھاتی پر ایک ایسی سخت ضرب لگائی کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو وہ اٹھا اور شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور کلمۂ شہادت زبان پر لایا۔ لوگوں نے آفرین وستائش کے نعرے بلند کیے اور اس دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار مغلوں نے اپنے سروں

کی بودیاں کٹوا ڈالیں اور مسلمان ہوگئے۔ خان کا ختنہ ہوا اور نورِ اسلام کی برکت سے کفر کی تاریکیاں دور ہوگئیں۔ اُس وقت سے اسلام ان تمام شہروں میں مضبوطی سے قائم ہوگیا جو چغتائی خان کے جانشینوں کے زیرنگیں تھے......

......گزشتہ صفحات میں ان وسائل وذرائع کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے مسلمان ان وحشی قبیلوں کو اپنے دین پر لے آئے جنہوں نے ان کے تمدن کے مرکزوں کو تباہ و برباد کیا تھا۔ اس طرح سے اسلام اپنے گزشتہ عروج کے کھنڈروں سے دوبارہ آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہوا اور اس نے ایک صدی کی افسردگی اور پژمردگی کے بعد ایک غالب مذہب کا مقام حاصل کرلیا۔[۱]

متاثر کن دعوت کا تیسرا دور

برصغیر پاک و ہند میں ایسے مخلص مبلغین تشریف لائے جنہوں نے ہزاروں لاکھوں کفار کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر ہدایت کی شاہ راہ پر گامزن کر دیا۔ خواجہ معین الدین اجمیری‘ نظام الدین اولیاء‘ علی بن عثمان ہجویری‘ مشائخ چشت اور دیگر اولیاء اللہ ؒ کی تبلیغی کوششوں سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے نہ صرف بہت سے کافروں کو کلمہ پڑھایا‘ بلکہ مسلمان حکمرانوں کے پیدا کردہ بگاڑ کی بھی مؤثر اصلاح کی۔ شاہ ولی اللہؒ کی دینی مساعی سے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی دینی شعور میں ترقی ہوئی‘ بلکہ سیاسی میدان میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جس نے مرہٹہ ہندوقوت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ان بزرگانِ دین کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۷ء میں ایک مسلمان مملکت مشرقی اور مغربی پاکستان کے نام سے دنیا میں وجود میں آگئی۔

ریاستِ مدینہ اور ریاستِ پاکستان

متاثر کن شخصیات کی دعوتِ دین کی محنت کے حیران کن نتائج کی یہ چند مثالیں ہیں‘ جن کی وجہ سے عالمی سیاسیات تبدیل ہوچکی ہیں۔ متاثر کن شخصیات کی سیرت وکردار کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخصیات یقین میں کامل اور اسلامی معاشی ومعاشرتی اخلاق کا

(۱) ماخوذ از: دعوتِ اسلام‘ مصنفہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ (علامہ اقبال کے استاد) مترجم: ڈاکٹر عنایت اللہ‘ شائع کردہ: محکمہ مذہبی امور واوقاف پنجاب۔

بہترین نمونہ تھے۔ اسلام نے ان میں کردار کی مضبوطی، عزمِ راسخ، قوتِ ارادہ، صبر وتحمل اور تلخ ترین مصائب کی موجودگی میں تسلیم ورضا کی خو پیدا کر دی تھی۔ متوکل علی اللہ اور لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہ کی تصویر تھے اور ان کی مسخر کرنے والی کرامات کا راز اتباعِ رسول ﷺ میں پوشیدہ تھا۔

جس طرح ریاست مدینہ کی معاشرتی اکائیوں میں مہاجرین وانصار کے علاوہ تیسرا مخالفین کا عنصر یہود، کافر اور منافقوں کی صورت میں تھا، بعینہٖ ۱۹۴۷ء میں وجود میں آنے والے ملک پاکستان کی معاشرتی اکائیوں میں بڑی اکائیاں مہاجرین وانصار اور مخالفین اسلام کا تیسرا عنصر مفاد پرست سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور انگریزوں کے پٹھو بیوروکریٹس کا تھا۔ ریاست مدینہ کے اہل ایمان نے رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں اسلام مخالف عناصر کی تمام سکیموں کو ناکام بنایا اور اسلام کو غالب کیا، لیکن مملکت پاکستان میں اسلامی قوتیں اسلام مخالف عناصر کو شکست دینے کی بجائے ان کے ہاتھوں ہزیمت زدہ ہو کر اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیے جانے کا ذریعہ بن گئیں جو دُنیوی مفاد پرست اور اسلام مخالف قوتوں کے آلہ کار تھے۔ اس کی سزا ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک شکست کے بعد مملکت خداداد پاکستان کے دولخت ہونے اور بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آنے والی ہندوؤں کی پٹھو حکومت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

جس طرح دینی سیاسی جماعتوں نے مروّجہ سیاست میں شامل ہو کر پاکستان میں دینی اجتماعیت کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح دعوتِ دین کے نبوی مقاصد سامنے نہ ہونے کی وجہ سے تبلیغی اور دعوتی مساعی کے نتیجہ میں دعوتی اور تبلیغی فرقہ بندیاں وجود میں آچکی ہیں۔ چنانچہ ہر جماعت نے اپنا دعوتی باز و بنا لیا ہے، جس کے نتیجے میں اختلافات اور زیادہ پختہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کا کام صفر ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی حال ہماری مساجد اور دینی مدارس کا ہے۔ اصل اہداف کو چھوڑنے کی سزا یہ مل رہی ہے کہ ان کو اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل نظر آرہا ہے۔

انجمن ہائے خُدّامُ القرآن کے اصل اہداف

مساجد، مدارسِ دینیہ اور انجمن ہائے خدام القرآن کے اہداف کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کے درج ذیل مقامات رہبر کامل ہیں:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجن)

''اور یہ کہ مسجدیں (خاص) اللہ کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔''

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ (التوبۃ)

''اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اُمید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں (داخل) ہوں گے۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے؟ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں مال وجان سے جہاد کرتے رہے، اللہ کے ہاں ان کے درجے بہت بڑے ہیں۔ اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔''

ان آیات کے الفاظ ومعانی کو غور وفکر کی پوری قوت سے نچوڑیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ مساجد و مدارس، قرآن اکیڈمیز اور انجمن ہائے خدام القرآن کے قیام کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے علمی اور عملی راہنمائی اور قوت فراہم کرنا ہی ہے۔ اگر ان کے پیش نظر اللہ کی راہ میں جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ کے کلمے کی سربلندی نہیں ہے تو ایسی مساجد اور مدارس اور ان کے چلانے والوں کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ ایسی صورت میں ہم قوم کا سرمایۂ مال وجان کن مقاصد میں لگا رہے ہیں؟ اسی طرح ہماری دعوت کا ہدف اقامتِ دین نہیں ہے تو ہماری دعوت کی مساعی میں اللہ کی نصرت کیسے آسکتی ہے؟ اللہ کے دین کے قیام کی ذمہ داری اُمتِ مُسلمہ پر فرض ہے جو قرض کی طرح واجب الادا ہے اور اس کی ادائیگی کی محنت کیے بغیر قیامت کے دن ہم اللہ تعالیٰ کو منہ دکھلانے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾﴾ (الشوریٰ)

''اپنے پروردگار کا حکم قبول کرو قبل اس کے کہ وہ دن جو ٹلے گا نہیں اللہ کی طرف سے آموجود ہو۔ اس دن تمہارے لیے نہ کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ تم سے کوئی انکار بن پڑے گا۔''

کون سا حکم ہے جسے قبول کرنے کا حکم دیا جارہا ہے؟ وہ اسی سورہ کی درج ذیل آیات میں وضاحت سے بیان کردیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۴ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵ وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝۱۶ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝۱۷﴾ (الشوریٰ)

''اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کو (اختیار کرنے) کا حکم نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جس کی (اے محمد ﷺ) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے۔ اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا۔ (وہ یہ) کہ دین کو قائم کرو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ جس چیز کی طرف تم بلاتے ہو وہ مشرکوں کو دشوار گزرتی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کام کے لیے چن لیتا ہے اور جو اُس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف راستہ دکھا دیتا ہے۔ اور یہ لوگ جو الگ الگ ہوئے ہیں تو علم (حق) آچکنے کے بعد آپس کی ضد سے (ہوئے ہیں) اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک وقت مقررہ تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کردیا جاتا۔ اور

جو لوگ ان کے بعد اللہ کی کتاب کے وارث ہوئے ہیں وہ اس (کی طرف) سے شبہ کی الجھن میں (پھنسے ہوئے) ہیں۔ تو (اے محمد ﷺ) اسی (دین) کی طرف (لوگوں کو) بلاتے رہو، اور جیسا تمہیں حکم ہوا ہے (اسی پر) قائم رہنا، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔ اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل کی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں، اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا رب ہے۔ ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ ہم میں اور تم میں کچھ بحث تکرار نہیں۔ اللہ ہم (سب) کو اکٹھا کرے گا، اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور جو لوگ اللہ (کے دین کے بارے) میں بعد اس کے کہ اس کو مان لیا گیا، جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے، اور ان پر (اللہ کا) غضب اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اللہ ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل کی اور (عدل کی) ترازو بھی۔ اور تم کو کیا معلوم وہ گھڑی (جس میں زمین و آسمان کا نظام درہم برہم کر کے مہلت عمل ختم کردی جائے گی) قریب ہی آپہنچی ہو۔''

دعوت کے ضمن میں ہماری ذمہ داری

دعوتِ دین میں زندگیاں لگا دینے یا کھپا دینے کا مطلب کیا دعوت دعوت کرتے زندگی گزار دینا ہے یا کچھ اور ہے؟ اگر سلف الاسلاف اس کا یہی مطلب سمجھتے تو کہیں دنیا میں دین قائم ہوسکتا تھا؟ جبکہ ہمارے اسلاف نے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں دین کے ڈھانچہ میں آنے والے بگاڑ کی اصلاح کے لیے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں دعوت کا حکم دیا ہے اسی کے ساتھ مجادلہ حسنہ کا حکم بھی ہے، جس کا مطلب ہے کہ باطل کے پرستاروں کے ساتھ جھگڑا کر کے انہیں حق کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اسلام کو چھوڑ کر نظام باطل کو مسلمانوں پر نافذ کرنے والے مسلمان حکمرانوں کا دامن تو پکڑا جائے۔ صفحات گزشتہ میں شیخ رشید الدینؒ کے واقعہ مذکور کے مطابق اگر اللہ کو دین کا نفاذ منظور ہے اور یقیناً ہے، نبی کریم ﷺ کی واضح پیشین گوئیاں غلبۂ دین کے لیے موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں میں قوت ڈال دے گا۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہمیں یہ احساس شدید ہو کہ اقامتِ دین ہماری ذمہ داری ہے اور یہ ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ اس لیے ہماری دعوت کا نصب العین اور ہدف اقامتِ دین ہونا چاہیے۔

(باقی صفحہ 89 پر)

آدابِ دعوت

محمد سہیل راؤ ☆

دعوت وتبلیغ کی ضرورت واہمیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔قرآن پاک کی متعدد آیات اور رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں اس کام کی اہمیت وفضیلت اور اس کا اجر وثواب بیان کیا گیا ہے اور اس سے پہلوتہی کرنے پر سخت وعید اور عذاب کی خبر دی گئی ہے۔حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾﴾ (الانفال)

''اور تم ایسے وبال سے بچو جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں' اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔''

نیز ایک حدیثِ نبوی ﷺ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ایک بستی پر عذاب نازل کرنے اور بستی کو اُلٹ دینے کا حکم دیا۔حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا: یا اللہ اس میں تو آپ کا ایک ایسا عبادت گزار بندہ ہے جس نے آج تک پلک جھپکنے کے برابر بھی کوئی نافرمانی اور گناہ کا کام نہیں کیا۔اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ اس کے سمیت پوری بستی کو اُلٹ دو کہ اس کا چہرہ کبھی میری حمیت میں متغیر نہیں ہوا''۔(بیہقی' مشکوٰۃ شریف) اس کے سامنے غلط کام ہوتے تھے' میری نافرمانیاں ہوتی تھیں' کبھی اس نے منع نہیں کیا' روک ٹوک نہیں کی' اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا' لہٰذا اس کو بھی عذاب میں ہلاک کر دیا جائے۔اس سے دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غلطیاں اور کوتاہیاں تو ہم سے بہت ہوتی ہیں' بہتوں سے ہوتی ہیں' تمام کاموں میں

☆ نقیب اسرہ' کورنگی غربی تنظیم حلقہ کراچی جنوبی

ہوتی ہیں' لیکن دعوت الی اللہ واقعی بڑا نازک کام ہے۔یہ ایک اہم اور عظیم الشان کام ہے۔یہ نبیوں والا کام ہے۔اس کام میں اگر دانستہ یا نادانستہ غلطی ہو جائے تو اس کا نقصان بھی ہوتا ہے' اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ بھی ہوتی ہے۔اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ سردارانِ قریش کو دعوت دے رہے تھے۔اسی دوران ایک نابینا صحابی عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ دین کی کوئی بات سیکھنے کے لیے آ گئے اور آدابِ مجلس کی رعایت کیے بغیر آپ ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔آپ ﷺ نے اس وقت ان کی طرف توجہ نہ فرمائی اور سردارانِ قریشِ مکّہ کی طرف متوجہ رہے۔ان کی بار بار کی خلل اندازی کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر کچھ ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے۔رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کی گئی اور سورۂ عبس کی ابتدائی آیات اسی سلسلہ میں نازل ہوئیں۔اس کے بعد جب کبھی عبداللہ بن اُمِّ مکتومؓ آتے تھے تو رسول پاک ﷺ ان کا استقبال کرتے اور فرماتے کہ ''مرحبا وہ شخص جس کی وجہ سے میرا ربّ مجھ سے ناراض ہوا!'' یہ واقعہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں سید المرسلین ﷺ کو بھی تنبیہ کی گئی۔اگر ہم چھوٹوں سے دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں کوتاہی ہوگی تو ہم بھی عتاب اور تنبیہ کے مستحق ہوں گے۔

نیز خلافِ اصول کام کرنے کے نقصانات بھی بہت ہوتے ہیں' اس لیے دعوت کے اصول وآداب سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اور ہمیشہ ان اصول وآداب کا مذاکرہ واستحضار بھی ہونا چاہیے۔ذیل میں دعوت وتبلیغ کے انہی اصول وآداب کو بیان کیا جاتا ہے:

(۱) آداب سیکھنے کے لیے جِدّوجُہد: قرآن حکیم میں جہاں جہاں دعوت سے متعلق آیات ہیں وہاں پر علماء کی تفاسیر کا مطالعہ کریں۔رسول پاک ﷺ کی سیرت کو مسلسل مطالعہ میں رکھیں۔لٹریچر سے فائدہ اٹھائیں۔بہت سا مواد ہمیں ایسا مل جائے گا جو اس موضوع پر ہماری راہنمائی کرے گا۔مثال کے طور پر عقل کا فیصلہ' سلامتی کا راستہ' (از مولانا مودودیؒ)' غلطیوں کی اصلاح کا نبوی طریقہ کار (علامہ محمد صالح المنجد کی عربی تالیف ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے)' دعوتِ دین اور اس کا طریق کار (از مولانا امین احسن اصلاحیؒ)' داعی کے اوصاف۔ویڈیو بیان (از حافظ انجینئر نوید احمدؒ) دعوت الی اللہ' ختمِ نبوت کے دو مفہوم اور تکمیلِ رسالت کے عملی تقاضے (از ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

(۲) دل میں شکر کی کیفیت: جب بھی اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمائے تو دل سے شکر کے جذبات پھوٹنے چاہئیں۔ اندر سے انسان سرور محسوس کرے کہ یہ اللہ کا احسان ہے جس نے مجھے اس کام کے لیے چنا ہے اور مجھے رسول اللہ ﷺ کے راستے پر لگایا ہے۔ رسول' زمین پر اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندے ہوتے تھے اور جو کام اللہ تعالیٰ ان سے لیتے تھے تو مجھے بھی اس کی توفیق عنایت فرمائی ہے۔ لہٰذا ضرور شکر ادا کیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ مزید اس عمل کی توفیق عنایت فرمائے۔

(۳) دعوت رجوع الی القرآن: داعی کسی مسلک کی تبلیغ نہ کرے' کسی فرقہ واریت کی دعوت کو لے کر نہ اٹھے' بلکہ ایمان یا عمل کی دعوت بذریعہ قرآن دے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ)) (ترمذی) یعنی جو لوگوں کو قرآن کی طرف دعوت دے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور سیدھے راستے کی ہدایت دے گا۔

(۴) قیام النّھار سے پہلے قیام اللّیل کا اہتمام: سورۃ المدثّر میں رسول اللہ ﷺ کو فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے! (ﷺ) کھڑے ہو جایئے اور خبردار کیجیے' اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجیے''۔ یہ دن میں قیام کا ذکر ہے جس کا حکم اللہ عزوجل نے اپنے حبیب ﷺ کو دیا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ المزمل ہے جس میں قیام اللّیل یعنی تہجد کا اہتمام کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ دن بھر محنت سے پہلے رات کو دعاؤں کا اہتمام بھی کیا جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی دعائیں کی ہیں کہ یا اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میرا معاون بنا دے —— دعاؤں سے اللہ تعالیٰ دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ آدَمَ كُلَّهَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ یُصَرِّفُهٗ حَیْثُ یَشَاءُ)) (صحیح مسلم)

''تمام انسانوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں' اللہ جدھر چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔''

حدیث کے آخر میں ایک دعا بھی موجود ہے: ((اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِكَ)) ''اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے''۔

ہمیں اس دعا کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

(۵) جذبہ نصح و خیر خواہی: انسانی ہمدردی کے تحت یہ فریضہ سرانجام دیا جائے۔ ہم میں تڑپ ہونی چاہیے کہ اللہ کا دین ایک خیر ہے' مجھے یہ خیر دوسروں تک پہنچانا ہے اور لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ بچانے کی فکر ایسی ہو جیسے کہ بجلی کے کرنٹ سے بھرے تار پانی میں پڑے ہوں اور ہمارے بچے اس پانی کی طرف بڑھ رہے ہوں تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ کیا صرف زبان سے کہیں گے کہ بیٹا وہاں مت جاؤ! دوسروں سے کہیں گے کہ اس کو روکنا! یا خود اٹھ کر آگے بڑھ کر اس کو پکڑیں گے؟ دیکھیں یہاں اگر ہم نے سستی کی تو کیا ہوگا؟ ہمارا عزیز موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ جہنم سے بچانے میں تساہل برتا تو پھر وہاں تو انسان نہ مرے گا نہ جیے گا۔ فریاد کرے گا کہ یارب مجھے موت دے دے' لیکن اسے موت آئے گی نہیں۔

(۶) داعی کی ذمہ داری پہنچانا ہے' نہ کہ منوانا: ہماری کامیابی اس بات میں ہے کہ ہم اپنے حصہ کا کام خلوص کے ساتھ سرانجام دیں۔ اگر انسان اپنی ذمہ داری منوانا سمجھ لے گا تو ضرور بالضرور اپنے اصولوں کو توڑے گا' ضرور سودے بازی پر آجائے گا۔ رسول اکرم ﷺ کو تو یہاں تک فرمایا گیا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (القصص:۵۶) ''(اے نبی ﷺ) آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ چنانچہ ہماری ذمہ داری خلوص کے ساتھ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔

(۷) دعوت کے نتائج سے مایوس نہ ہوں: دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ ہم نے دعوت کا کام کیا اور کسی ایک نے بھی ہماری دعوت کو قبول نہ کیا' نتیجتاً ہماری محنت بھی ضائع ہوگئی' انفاق بھی ضائع گیا' ہمارا پروگرام بھی فلاپ ہوگیا۔ یہ سوچ ہمارے رفقاء میں مایوسی لائے گی۔ ہم نے دین کی دعوت کا کام کیا ہے یا یوٹیوب پر ویڈیو اپلوڈ کی ہے؟ وہاں یہ ہوتا ہے کہ ویڈیو اپلوڈ کرنے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ کتنے viewer ہوگئے' کتنے لوگوں نے like کیا۔ دیکھئے مکہ میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے نتیجے میں ابتدائی ۱۳ برسوں میں کم و بیش سوا سو افراد ایمان لائے اور مدینہ میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایک سال میں ۷۲ افراد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو اگر اوسطاً ایک سو سال میں ایک شخص بھی قبول کرتا تو ۹۵۰ سال میں ۹۵ ہونے چاہئیں تھے جو کہ نہیں تھے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ سے واپسی پر جو

ظاہری صورتحال تھی اس سے صحابہ کرام ؓ غمزدہ تھے‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین کہا ہے۔ اس لیے ظاہری نتائج سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

(۸) منصوبہ بندی کرنا: دعوت کے اثرات اگر نظر نہیں آ رہے تو اس سے یہ سبق لیتے رہنا چاہیے کہ شاید ہماری کوشش میں کمی رہی ہو اور ہم سے حق ادا نہ ہو سکا ہو جس کی وجہ سے اللہ عزوجل نے یہ نتیجہ ہمیں دکھلایا ہے۔ کوشش کی مقدار کو بھی بڑھا دیں اور دعا کی کیفیت میں بھی اضافہ کر لیں۔ منصوبہ بندی کرنے کے لیے شرکاء کے کوائف کو بھی مرتب کریں تاکہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

(۹) اللہ کا دین تمام لوگوں کے لیے ہے: داعی کے کسی رویہ سے یہ تاثر قائم نہ ہو کہ تنظیم فلاں طبقہ‘ فلاں مسلک یا فلاں علاقہ ہی کے لوگوں کے درمیان اپنا دعوتی کام کر رہی ہے۔ سورۃ الاعراف میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (آیت ۱۵۸) ’’(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں‘‘۔ سورۃ البقرۃ میں اُمّتِ مُسلمہ کے بارے میں کہا گیا: ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (آیت ۱۴۳) ’’تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو‘‘۔ اس لیے ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم ہر ایک تک پہنچیں‘ تاکہ ہر شخص دین کی حقیقت سے واقف ہو جائے۔

(۱۰) گفتگو میں نرمی اختیار کرنا: حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ’’نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اسے سنوار دیتی ہے اور سختی جس چیز میں ہوتی ہے اسے بگاڑ دیتی ہے‘‘۔ دیکھیں ہم جس کو دعوت دینے کے لیے جائیں گے وہ فرعون سے زیادہ گمراہ تو نہیں ہوگا اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر داعی نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾﴾ ’’فرعون سے نرم بات کرنا‘ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے‘‘۔ تو جو حق اللہ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب سے سخت کلامی کریں‘ اس پر فقرے کسیں‘ اس کی توہین کریں‘ وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا؟ ابن تیمیہؒ کا بہت عمدہ قول ہے کہ ’’معروف کا حکم معروف طریقہ پر دینا ہے اور منکر سے روکنا منکر طریقہ سے نہ ہو‘‘ یعنی ایک منکر سے روکتے ہوئے دوسرا منکر جنم نہ لینے پائے۔ صفائی صاف کپڑے سے کی جاتی ہے نہ کہ صفائی کے لیے گندا کپڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ نبیوں والا کام

ہے‘ چنانچہ نبیوں والے اخلاق کے ساتھ ہونا چاہیے۔

(۱۱) مشکلات کے لیے پہلے سے ذہناً تیار رہنا: اگر حق بات کریں گے تو لازماً صبر کے مراحل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لوگ ہار نہیں پہنائیں گے‘ مبارکباد نہیں دیں گے‘ کندھوں پر نہیں اٹھائیں گے‘ استقبال نہیں ہوگا۔ نبیوں اور ان کے ساتھیوں کو اس راستے میں دیے گئے القابات یاد رکھیں: مجنون‘ کذاب‘ السفہاء‘ ساحر۔ آپ بات کر رہے ہوں اور سامنے والا کانوں میں انگلیاں ڈال لے تو کیسا لگے گا؟ یہ سب پیارے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہوا ہے‘ تو اس سے دل چھوٹا نہیں کرنا۔ پیش نظر یہی رہے کہ میں ساری محنت اس لیے کر رہا ہوں کہ میری آخرت سنور جائے‘ چنانچہ میرا اصل مقصد بس یہی ہے۔ ع بہار ہو کہ خزاں‘ لا الٰہ الا اللہ! اللہ سے ہمیشہ عافیت کا سوال کرنا ہے‘ مشکل مانگنی نہیں ہے‘ لیکن اگر آ جائے تو گھبرانا بھی نہیں ہے۔

(۱۲) ذاتی کاموں پر اس کو ترجیح دینا: دین کے لیے یہ سوچ نہ ہو کہ میں اپنا بچا کھچا وقت اسے دوں گا۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنا کوالٹی ٹائم نہیں دیں گے تو اللہ بھی ہمیں اپنی سب سے قیمتی نعمت ہدایت سے نہیں نوازے گا‘ ہمیں دین نعمت محسوس نہیں ہوگا‘ وہ کیفیت ہماری نہیں ہوگی کہ ایمان والے وہ ہیں کہ جب ان پر آیاتِ الٰہیہ تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اللہ بادشاہ ہے نہ کہ فقیر۔ فقیر کو تو چاہے ہم دس روپے دے دیں‘ چاہے سو روپے دے دیں یا کہیں کہ معاف کرو۔ اللہ کے دین کو ہم نے اپنی زندگی کا قیمتی ترین وقت دینا ہے تاکہ اللہ بھی ہمیں اپنی سب سے قیمتی متاع نعمت ہدایت سے نوازے‘ اپنی رضا ہمیں عطا فرمائے۔

یہ بالکل غلط سوچ ہے کہ میں اللہ کے دین کو اپنا بچا کھچا وقت دے دوں یا ریٹائرمنٹ کے بعد دین کا کام کروں گا‘ دین پر عمل جب تک کروں گا جب تک کہ اس سے دنیا کا کچھ نقصان نہ ہو۔ یہ طرزِ عمل قرآن پاک میں منافقین کا نظر آتا ہے کہ دین پر عمل جب تک کریں جب تک اس سے دنیا کا کچھ نقصان نہ ہو۔ اگر ہم دین کو کسی ذاتی مصروفیت کی وجہ سے اپنا وقت نہیں دے پا رہے تو ہماری کیفیت کیا ہونی چاہیے؟ سورۃ التوبہ میں آتا ہے کہ جب کچھ صحابہ کرام ؓ سواری نہ ہونے کی وجہ سے رسول کریم ﷺ کے ساتھ شرکت نہ کر سکے تو وہ وہاں سے روتے ہوئے لوٹے۔ ان کے دل کی اس کیفیت کی بنا پر ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ اب تم جو بھی عمل کرتے ہو وہ تمہارے ساتھ اجر میں شامل ہوتے ہیں‘ کیونکہ اللہ ان کے دلوں کا

حال جانتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔ ہم بھی اگر چکی کی مشقت یا ذاتی مصروفیت کی وجہ سے امیر کے تقاضے پر لبیک نہ کہہ سکیں تو اس کا غم ضرور رہنا چاہیے تاکہ اللہ ہمیں اجر میں شامل فرمالے۔

(۱۳) داعی کا اپنا عمل: اگر اپنا عمل ٹھیک نہیں ہے تو داعی کی ساری دعوت بجائے فائدہ مند ہونے کے نقصان دہ ہوگی۔ سورۃ الصّف میں فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳﴾﴾ ''اے اہلِ ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ یہ بات اللہ کو بیزار کرنے والی ہے کہ تم وہ کہو جو کرو نہیں''۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے علماء کو ڈانٹا ہے: ﴿اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ (آیت ۴۴) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو!''

(۱۴) دعوت اِلی اللہ کے لیے ترغیب وتشویق: قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں اس عمل کے کرنے والوں کی فضیلت اور نہ کرنے والوں سے متعلق وعید پر مبنی آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتے، زمین کی تمام مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اور سمندر میں مچھلیاں خیر کی دعا کرتی ہیں ان کے لیے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اپنے رفقاء کو باور کراتے رہیں کہ یہ چیزیں ناپ تول میں آنے والی نہیں ہیں، بلکہ ہمیں اس کو محسوس کرنا ہے۔

(۱۵) خیال رہے کہ لوگ اُکتا نہ جائیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو رسول اللہ ﷺ کو اپنی جانوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے، ان کے لیے ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ آپؐ کی باتیں سننے سے اُکتا جائیں گے۔ اس کے باوجود ان کے لیے بھی آپ ﷺ کی عادت یہ تھی کہ وعظ ونصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اُکتا نہ جائیں اور دوسروں کو بھی آپ ﷺ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔ ایسا نہ ہو جائے کہ مدعی ہم سے ایک بات اتنی بار سن چکا ہو کہ ہمارے کہنے سے پہلے وہ بتا دے کہ ہم کیا کہنے والے ہیں۔

(۱۶) زیادہ زور آخرت پر دیں: دین پر عمل سے متعلق دنیاوی فوائد بھی بتا سکتے ہیں کہ استغفار کرو اور اللہ سے مخلص ہو جاؤ، اللہ مال میں بھی اضافہ کر دے گا، اللہ تمہیں بیٹے بھی دے گا، بارشیں بھی ہوں گی، پھل بھی بہت ہوں گے۔ لیکن یہ ضرور بتائیں کہ دنیا میں کسی کو کچھ ملا ہے تو وہ اللہ کا انعام نہیں، امتحان ہے اور اگر کسی کو کچھ نہیں ملا ہے تو وہ اللہ کا عذاب نہیں بلکہ امتحان ہے۔ اور اس صبر وشکر کے امتحان میں قارون اور فرعون بری طرح ناکام ہوئے ہیں، بلال و مصعب رضی اللہ عنہما کامیاب ہو گئے ہیں۔

(۱۷) احسان کے درجہ پر عمل: دو نماز پڑھنے والوں کا اجر بھی ایک جیسا نہیں ہوتا، کیونکہ خشوع وخضوع اور حسبِ حال کے اعتبار سے فرق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دعوت کا عمل کرنے والا کوشش کرے کہ زیادہ سے زیادہ دل جمعی اور احسن انداز میں اس عمل کو انجام دے۔

(۱۸) نیت کا جائزہ: ہمیں جس سے اجر مطلوب ہے وہ ہستی علیمٌ بذات الصدور ہے، لہٰذا بار بار نیت کا جائزہ لینا چاہیے کہ یہ ساری محنت کس کے لیے ہو رہی ہے؟ مزید یہ کہ نیت کا ایک مرتبہ درست کر لینا کافی نہیں ہے، ممکن ہے کہ ایک کام شروع خلوصِ نیت سے کیا جائے اور بعد میں نیت میں بگاڑ آ جائے، تو عمل سے پہلے، دورانِ عمل اور اختتام پر بھی مراقبہ کرنا چاہیے کہ یہ سب محنت اللہ کی رضا کے لیے کی جا رہی ہے۔

(۱۹) دعوت میں ترتیب کا لحاظ رکھیں: ''الاقرب فالاقرب'' کی بنیاد پر اس عمل کو آگے بڑھائیں۔ یہ ایک فرد کی اپنی ذات اور اس کے اہل وعیال سے ہو کر اس کے کنبے، قبیلے، پھر قوم اور بالآخر پوری نوعِ انسانی تک پہنچنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی نہ سوچا جائے کہ پہلے حصہ کے منفی ردِعمل سے غم زدہ ہو کر اسی پر اٹکا رہے، بلکہ اپنی سی کوشش کر لے اور پھر آگے بھی بڑھتا رہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے والد، نوح علیہ السلام کا بیٹا اور اہلیہ، حضور ﷺ کے چچا ابولہب کی مثالوں کو سامنے رکھیں۔

(۲۰) ہر ایک کو حسبِ حال دعوت دینا: نوجوان اور ضعیف، پڑھے لکھے اور ان پڑھ کو دعوت دینے میں فرق ملحوظ رکھے اور عمدہ طریقے سے دعوت کا فریضہ سرانجام دے۔ دعوت بالحکمۃ، عمدہ نصیحت اور مجادلہ احسن سے کیا مراد ہے، اس کے لیے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(۲۱) تکریمِ انسانیت: لوگوں کے سامنے ہمیں تکریمِ انسانیت کا پہلو بھی اُبھارنا چاہیے، جس

سے یہ معلوم ہو کہ کوئی انسان ذلیل اور پست نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اخلاقیات کے لحاظ سے پست ہے تو سمجھ میں بات آتی ہے‘ لیکن یہ تصور کرنا کہ ایک شخص فلاں گھرانے میں پیدا ہوا ہے‘ اس لیے پست ہے‘ یہ غلط بات ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عظمت دی ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل)

’’ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔‘‘

یہ اللہ کا کرم ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں انسانوں ہی کے لیے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ کہا ہے۔ اس سے بڑا اعزاز و اکرام اور کیا ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کو محترم بنایا ہے اور دنیا کے اندر اسے ذمہ دارانہ حیثیت دی ہے۔

(۲۲) دعوت کے وقت کا مفید مراقبہ: تبلیغ و دعوت کے وقت بالخصوص اپنے باطن کا رخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رکھنا چاہیے‘ نہ کہ مخاطبین کی طرف۔ گویا اس وقت ہمارا دھیان یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے اور اس کے کام کے لیے نکلے ہیں اور مخاطبین کی توفیق بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جب یہ دھیان ہو گا تو ان شاء اللہ مخاطبین کے غلط برتاؤ سے نہ تو غصہ آئے گا اور نہ ہمت ٹوٹے گی۔

(۲۳) مشورہ کی اہمیت اور اطاعت امیر: مشورہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس کا حکم قرآن پاک میں بھی دیا گیا ہے اور اہلِ ایمان کے اوصاف میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اہم معاملات شورائی طریقہ پر طے کرتے ہیں۔ مشورہ کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے۔ آپؐ خود بھی مشورہ فرماتے تھے اور اُمت کو بھی آپؐ نے مشورہ کرنے کا حکم دیا۔ اپنے نظم بالا کو صحت مند ماحول فراہم کیا جائے اور جس عمل کو کرنے کا امیر فیصلہ فرمائیں‘ ممکنہ حد تک اس کو بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کی جائے۔

(۲۴) متقدمین سے محبت اور ان کا شکر ادا کرنا: دین کی نعمت جن وسائط سے ہم تک پہنچی ان کا شکر و اعتراف اور ان سے محبت نہ کرنا محرومی ہے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: ((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ)) (ترمذی) ’’جس نے (اپنے محسن) لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا

اس نے اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کیا‘‘۔ چنانچہ اپنے محسنین کا شکریہ ہم پر لازم ہے جن کے ذریعے سے دین ہم تک پہنچا ہے۔

(۲۵) دعوتِ دین: اُمت کا فرضِ منصبی: اہم تر بات یہ ہے کہ ایک داعی کے فکر اور سوچ میں یہ بات بیٹھی ہو کہ یہ کوئی نفلی کام نہیں ہے‘ کوئی اضافی نیکی نہیں ہے‘ بلکہ میری نجات ہی نہیں ہو گی جب تک میں یہ کام سرانجام نہ دوں۔ از روئے قرآن:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

’’قسم ہے گزرتے ہوئے زمانے کی‘ کہ یقیناً سب انسان خسارہ میں جانے والے ہیں‘ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرتے رہے۔‘‘

ہم سے پہلی امتوں سے یہ سوال ہو گا کہ تم نے عمل کیا یا نہیں؟ لیکن ہمارا حساب مشکل ہے۔ ہم سے سوال یہ بھی ہو گا کہ تم نے عمل کے ساتھ ساتھ اس خیر کو دوسروں تک پہنچایا کہ نہیں پہنچایا؟ ہم خیر امت ہی اس بنا پر ہیں کہ ہم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنا یہ فرضِ منصبی اُمت کے ذمہ لگا کر گئے ہیں: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) (بخاری) کہ میری جانب سے پہنچاؤ‘ چاہے ایک ہی آیت کیوں نہ ہو‘ لہٰذا دنیا میں ہماری عزت و سربلندی ہی نہیں‘ بلکہ وجود و بقا کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ ہم اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہ ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں عرض کی گئی ہیں‘ ان پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۱۷)

اسلام کی سماجی اور معاشرتی اقدار

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۳۲ تا ۴۰ کی روشنی میں

شجاع الدین شیخ ☆

قرآن کریم کس قسم کا معاشرہ چاہتا ہے‘ اس حوالے سے چند بنیادی باتیں ہم سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عفت وعصمت کی حفاظت اور سدّالذرائع

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۲ سے آج کی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾﴾ ’’اور زنا کے پاس بھی نہ جاؤ‘ بیشک وہ بے حیائی ہے‘ اور برا راستہ ہے‘‘۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے جو اس وقت پوری دنیا کو درپیش ہے اور اس کے متعلق قرآن مجید کی کیا رہنمائی ہے‘ آیئے اس کا مطالعہ قدرے تفصیل سے کرتے ہیں — مرد اور عورت کا جنسی اختلاط جبکہ ان کے درمیان نکاح کا بندھن نہ ہو‘ زنا کہلاتا ہے۔ ایک فطری خواہش جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں رکھی ہے‘ اس کی تکمیل کے لیے نکاح کا بندھن عطا کیا گیا ہے۔

زنا ایک ایسا گناہ ہے جس سے بچنا ایک مسلمان کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اس بارے میں ہدایات بھی عطا فرماتا ہے‘ زنا کی برائی کا ذکر بھی آتا ہے‘ اس کی سزا کا بیان بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور پھر اس برائی سے بچنے کے لیے نکاح کے بندھن کا بھی بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر زوردار جنسی جذبات رکھے ہیں تاکہ نسلِ انسانی کی افزائش ہو سکے۔ نکاح کے بندھن کا ایک مقصد جہاں زوجین کی تسکین اور راحت کا

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

فراہم ہونا ہے‘ وہیں اس کا دوسرا مقصد اولاد کا حصول بھی ہے تاکہ نسل انسانی کا قافلہ آگے بڑھتا رہے۔

’’زنا کے قریب بھی مت جاؤ‘‘ سے مراد اُن تمام راستوں کے بند کرنے کا حکم ہے جو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ دین اسلام کی تعلیم اس قدر خوبصورت ہے کہ دنیا کے دیگر مذاہب کے قوانین اس وقت حرکت میں آتے ہیں جب جرم ہو چکا ہوتا ہے‘ جبکہ اسلام جرم کے راستے کو بھی بند کرنا چاہتا ہے۔ احتیاط پہلے بتاتا ہے اور علاج کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اس جرم سے بچنے کے لیے ان تمام راستوں پر پابندی لگا دی گئی جو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں یہ نہیں کہا کہ زنا نہ کرو‘ بلکہ فرمایا کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ’’سدّ الذرائع‘‘ کہتے ہیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کا وہ ہدف ہے جو اسلامی معاشرے کو دیگر معاشروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ذرائع پر پابندی اس لیے لگائی گئی تاکہ حیا اور ایمان محفوظ رہیں‘ گھرانے اور نسلِ انسانی محفوظ رہے۔ اس کے حوالے سے کئی تعلیمات عطا کی گئیں۔

اسلامی معاشرے کی نمایاں خصوصیات میں اولین مخلوط معاشرت سے اجتناب ہے۔ مَردوں اور عورتوں کا علیحدہ دائرۂ کار (مرد کا گھر سے باہر جبکہ عورت کا گھر کے اندر) رکھا گیا۔ مکانات کی خاص طرزِ تعمیر کہ زنانہ حصہ الگ اور مردانہ حصہ الگ ہو۔ ایسی محفلوں اور تقریبات کی حوصلہ شکنی جس میں مخلوط اجتماع کا امکان ہو۔ گھر سے باہر پردے کے احکامات دیے گئے (سورۃ الاحزاب‘ آیات ۳۲‘ ۳۳‘ ۵۳‘ ۵۵ اور ۵۹)۔ نامحرم شخص سے نرم لہجے میں بات نہ کی جائے۔ عزت و وقار سے گھر میں رہا جائے۔ گھر سے نکل کر دورِ جاہلیت کی طرح زیب و زینت کی نمائش نہ کی جائے۔ نامحرم خواتین سے ضروری گفتگو پردے کی اوٹ سے کی جائے۔ خواتین گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں چہرے پر چادر لٹکا لیا کریں۔ گھر کے اندر بھی پردے کے احکامات دیے گئے (سورۃ النور‘ آیات ۲۴‘ ۲۷ تا ۳۱‘ ۵۸ تا ۶۰)۔ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوا جائے۔ اگر گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے تو لوٹ جانا چاہیے۔ مرد اور خواتین گھر میں بھی نگاہوں کو نیچا رکھیں۔ مرد اور خواتین ستر وحجاب کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کریں۔ خواتین اپنے گھروں میں سینوں پر اوڑھنیاں ڈالے رکھیں۔ خواتین شوہروں‘ محرم مَردوں اور جان پہچان کی خواتین کے علاوہ کسی

کے سامنے اپنی زیب وزینت ظاہر نہ کریں۔

اس ضمن میں ایک اہم قدم نکاح کو بے جا رسومات کے سدِباب کے ذریعے آسان بنانا ہے۔ آج ہم نے نکاح کو مشکل بنا دیا ہے اور اس کے نتیجے میں زنا آسان ہو رہا ہے۔ بچیوں کی عصمت وعفت کو محفوظ کرنا ہے تو نکاح کو آسان کرنا ہوگا۔ نکاح کی سادہ سی تقریب مسجد میں منعقد کر لی جائے۔ شادی کے بعد صرف ایک دعوت یعنی دعوتِ ولیمہ ہے۔ مہر کی ادائیگی شوہر نے کرنی ہے۔ کفالت کی ذمہ داری شوہر پر ہے۔ یہ باتیں وہ ہیں جو نکاح کے انعقاد کے حوالے سے ہمیں شریعت نے بتائی ہیں۔

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرنے والے تمام امور پر پابندی ہو' مثلاً شراب نوشی' رقص وموسیقی' فحش لٹریچر' عریاں تصاویر اور بیہودہ فلمیں و ڈرامے وغیرہ۔ زانی کے لیے شریعت میں سخت سزا مقرر کی گئی ہے' جو غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے (النور:۲) اور شادی شدہ کے لیے رجم ہے جس کا ذکر بخاری شریف اور دیگر احادیث مبارکہ میں آتا ہے۔ اگر یہ سزائیں نافذ ہوں تو لوگ خوف کی بنا پر جنسی جرائم سے بچیں گے۔

مزید برآں' آیت زیر مطالعہ میں زنا کو ''فاحشہ'' یعنی برائی کا محرک کہا گیا جو درحقیقت ایمان کی ضد ہے۔ صحیحین کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً ..... وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ)) ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد حصے ہیں..... اور حیا ایمان کا ایک حصہ ہے''۔ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حیا اور ایمان دونوں ساتھی ہیں' اگر ایک چلا جائے تو دوسرا بھی چلا جائے گا۔''

آیت کے آخر میں زنا کو ''برا راستہ'' قرار دیا گیا ہے' کیونکہ یہ خاندان کے ادارے کو ہر اعتبار سے تباہ کرتا ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان اعتماد اور محبت کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر میں سکون کی فضا باقی نہیں رہتی اور انسان کا نسب محفوظ نہیں رہتا۔ والد کو اپنی اولاد کے حوالے سے شک ہو جاتا ہے' لہٰذا وہ اولاد کی پرورش اور تربیت پر مناسب توجہ نہیں دیتا۔ یہ تباہی اگر دیکھنی ہو تو فرانس چلے جائیں جہاں بوڑھے مرد وزن کُتّے اور بلیوں کی طرح گھومتے پھرتے نظر آئیں گے۔ وہاں بوڑھوں کی تعداد زیادہ' نوجوانوں کی تعداد کم اور شادی شدہ جوڑوں کی

تعداد بہت کم ملے گی۔ اگر گھرانے محفوظ نہ ہوں تو معاشرہ برباد ہو جاتا ہے' کیونکہ معاشرہ گھرانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

قتلِ ناحق کی ممانعت

آیت ۳۳ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾﴾ ''اور نہ قتل کرو ایسی جان کو جسے اللہ نے محترم فرمایا ہے' مگر جائز طریقے (یعنی شریعت کے حکم) سے' اور جو شخص ناحق قتل کیا گیا تو ہم نے اختیار دے دیا ہے اس کے وارث کو' پس اس کو چاہیے کہ بدلہ لینے میں زیادتی نہ کرے۔ بیشک اس کی مدد کی گئی ہے''۔ حرمتِ عزت کے بعد حرمتِ جان کا ذکر آیا ہے۔ پچھلی آیت میں زنا کی روک تھام کا ذکر تھا تاکہ انسانی عزت محفوظ رہے اور یہاں قتل ناحق سے منع کیا گیا ہے' اس لیے کہ قتل ناحق تمدن کی جڑ پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے۔ سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ﴾ (آیت ۳۲) ''جس نے ایک انسان کو قتل کیا بغیر کسی قتل کے قصاص کے یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے (کے جرم کی سزا) کے تو اُس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک جان کو بچایا گویا اس نے ساری انسانیت کو بچایا''۔ البتہ مندرجہ ذیل صورتوں میں کسی انسان کی جان لی جا سکتی ہے: شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا' قاتل کی بطور قصاص جان لینا (البقرۃ:۱۷۸)' حربی کافر کو قتل کرنا (التوبہ:۱۱۱) اور گستاخِ رسول ﷺ کو قتل کرنا۔ یہ سزا بھی رسول اللہ ﷺ نے نافذ کرائی اور تمام پیغمبروں کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے' لہٰذا کسی بھی پیغمبر کی شان میں گستاخی کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح اسلام سے مرتد ہونے والے کو (جو دین سے پھر جائے) قتل کرنا (البقرۃ:۵۴) اور رہزن یا اسلامی حکومت کے باغی کو قتل کرنا (المائدۃ:۳۳)۔

قاتل کے بارے میں فیصلے کا اختیار مقتول کے ورثاء کو ہے' اس سے ان کے زخم پر مرہم کا سامان ہوتا ہے۔ ورثاء چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں خون بہا دیت کی شکل میں ادا کیا جائے گا۔

آیت زیر مطالعہ میں قاتل کی جان لینے میں اسراف یعنی زیادتی سے منع کیا گیا ہے۔ دورِ جاہلیت میں اس کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ ایک صورت یہ تھی کہ مقتول کے ورثاء قاتل کو تڑپا تڑپا کر قتل کرتے تھے۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ خون بہا لینے کے بعد قاتل کی جان بھی لے لی جاتی تھی۔ آج بعض اوقات قاتل کے ساتھ اس کے بے قصور عزیزوں یا ساتھیوں کی جان لینے کا ظلم جاری ہے۔ یہ ہمارے قبائلی علاقوں میں بھی ہوتا ہے اور کبھی حکومتوں کی سطح پر بھی ہوتا ہے۔ نائن الیون کا ڈرامہ رچایا گیا اور اس میں ایک اسامہ بن لادن کا نام لے کر افغانستان کے دس پندرہ لاکھ لوگوں کو شہید کر دیا گیا' پندرہ بیس لاکھ لوگوں کو اپاہج کر دیا گیا اور لاکھوں لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ چودہ صدیوں پہلے کے ظالموں کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر آج بھی یہ ظالم موجود ہیں۔

حرمتِ مال اور ایفائے عہد

آیت ۳۴ میں ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ﴾ ''اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ' مگر اس طور پر جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائے اپنے شعور تک''۔ حرمتِ عزت و جان کے بعد اب حرمتِ مال کا ذکر ہے۔ شریعت کے احکامات کے یہ بنیادی مقاصد ہیں کہ لوگوں کی عزت' جان اور مال محفوظ رہے۔ یہاں خاص طور پر مالِ یتیم کا ذکر کیا گیا۔ یتیم کے مال پر بعض اوقات اس کے سرپرست حیلوں بہانوں سے قبضہ کر لیتے ہیں اور بعض اوقات یتیم بچوں کی ماؤں سے شادی کر کے یا یتیم لڑکیوں سے شادی کر کے ان کے مال پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیات ۲' ۳' ۵ اور ۱۰ میں یتیموں کے مال کے بارے میں تفصیلی ہدایات آئی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ یتیموں کا مال مت کھاؤ۔ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے ردی مال سے مت بدلو۔ اگر عدل نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو یتیم لڑکیوں یا یتیموں کی ماؤں سے نکاح مت کرو۔ یتیم کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ سمجھدار نہ ہو جائیں۔ یتیم کے مال کی حفاظت کا معاوضہ مت لو' البتہ اگر کوئی تنگ دست ہو تو مناسب حد تک لے سکتا ہے۔ جب یتیم سمجھدار ہو جائے تو گواہوں کی موجودگی میں اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یتیموں کا اس طرح خیال رکھو جیسے تم اپنے بچوں کے ساتھ حسن سلوک کی تمنا کرو گے' اس صورت میں کہ اگر خدانخواستہ تمہارا انتقال ہو جائے اور وہ یتیم

ہو جائیں۔ جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور روزِ قیامت جہنم میں داخل ہوں گے۔

اسی آیت میں آگے بیان ہوا: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۳۴﴾ ''اور عہد کو پورا کرو' بلاشبہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ ایفائے عہد کے حوالے سے حکم انتہائی تاکیدی اسلوب میں آیا ہے۔ خبردار کیا گیا کہ عہد کے حوالے سے روزِ قیامت باز پرس ہوگی۔ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے اور وہ قرض ہی کیا جو ادا ہو جائے''' لیکن یہ انتہائی غلط سوچ ہے۔ معاہدوں کی تین اقسام ہیں: (۱) اپنے آپ سے' (۲) بندوں سے' اور (۳) اللہ سے۔ نیکی کا ارادہ کرنا اور گناہ سے بچنا اپنے آپ سے وعدہ ہے۔ بندوں سے وعدے زبانی بھی ہوتے ہیں اور تحریری بھی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ اس کی عبادت کرنا اور اس کے رسول ﷺ کی نبوت کو تسلیم کر کے آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کا ہے۔ ایک مسلمان کی ساری زندگی وعدوں میں گھری ہوئی ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ' وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ' وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) وفی روایۃ لمسلم: ((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ)) ''منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے''۔ مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ ''اگرچہ وہ روزے رکھے اور نماز پڑھے اور گمان رکھے کہ وہ مسلمان ہے''۔ اسی طرح ایفائے عہد کے حوالے سے مشہور فرمانِ رسولؐ ہے: ((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ)) (مسند احمد) ''جس میں امانت داری نہیں ہے اس میں ایمان نہیں ہے اور جس کے اندر ایفائے عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔

ناپ تول پورا کرنا اور ڈنڈی نہ مارنا

آیت ۳۵ میں فرمایا گیا: ﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۳۵﴾ ''اور پیمانہ پورا بھرو جب کوئی چیز ماپو' اور تولو ترازو کی سیدھی ڈنڈی کے ساتھ' یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھا ہے''۔ یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت ہے۔ سورۃ المطففین کی ابتدائی آیات میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے بارے میں شدید

وعید کا بیان آیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③﴾ ''ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو کمی کرتے ہیں۔ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ کر لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ اور تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں''۔ یہ صرف ترازو کے پلڑے کی بات نہیں' آج کل الیکٹرونک اسکیل بھی ہیں اور ان میں بھی manipulation ہو سکتی ہے۔ کہیں کانٹے ہوتے ہیں جہاں بڑے بڑے ٹرک تولے جاتے ہیں۔ وسیع ہدایت یہ ہے کہ انسان جس پیمانے کو اپنے لیے پسند کرے' وہی پیمانہ دوسروں کے لیے بھی استعمال کرے۔ ہمارا معیار اپنے لیے کچھ اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہے اور یہ بھی ڈنڈی مارنا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ ہمارے گھر کے سامنے کوئی گاڑی اس طرح پارک کرے کہ گھر کا راستہ بلاک ہو جائے' لیکن جب ہم اپنی گاڑی کو پارک کرتے ہیں تو کیا اس معیار کو سامنے رکھتے ہیں کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے؟ اس مثال کو زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلا دیجیے۔

سب سے بڑی ڈنڈی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ مارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں وہ پوری لینا چاہتا ہے' لیکن اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا' اس کا حکم نہیں مانتا' اس کی کامل بندگی نہیں کرتا۔ ہم اللہ کو کچھ دے تو نہیں سکتے' البتہ اس کا تقاضا صرف عبادت کا ہے تو وہ تو پورا کر سکتے ہیں' لیکن ہماری اکثریت کا حال یہ ہے کہ ہم اس میں بھی ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کی حرکتوں سے محفوظ فرمائے۔

اتباعِ ظن کے بجائے تحقیق کی روش اختیار کرنا

آیت ۳۶ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ㊱﴾ ''اور اس کے پیچھے مت لگو جس کا تمہیں علم نہیں۔ بیشک کان' آنکھ اور عقل (کے استعمال) کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ انسان کا نظریہ اور عمل محض گمان اور تقلید کی بنیاد پر نہیں' بلکہ علم اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یہ انقلابی بات ہے جو قرآن عطا کر رہا ہے اور ہمیں علم کی تحریک دے رہا ہے' اور تحقیق اور جستجو کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ قرآن کا وہ انقلابی نعرہ ہے جو اس ماحول میں لگایا گیا جہاں آباء و اَجداد کی اندھی پیروی کا رواج تھا اور اکثریت اوہام پرستی کا شکار تھی۔ اسلام نے انسان کو ایسے تمام

اوہام کے خوف سے نجات دی جن کی بنیاد محض گمان یا تخمینوں پر تھی' جیسے ستارہ شناسی اور اسی طرح کی دیگر occult sciences۔ انسان کو پیروی علمی حقائق ہی کی کرنی چاہیے اور ایسے تمام نظریات یا خدشات کو اہمیت نہیں دینی چاہیے جو وہم' گمان یا تخمینوں پر مبنی ہوں۔

قرآن کی رو سے علم کی دو اقسام ہیں: علم ہدایت یا علم وحی اور علم بالحواس۔ ان دونوں کو سیکھنا ضروری ہے۔ ایک وہ علم ہے جو ہمیں کتاب وسنت کے ذریعے پہنچا اور ایک وہ علم جو انسان اپنے مشاہدات اور محنت سے حاصل کر رہا ہے۔ دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ بالاتر علم' علم ہدایت ہے۔ علم ہدایت' علم کی روح ہے جس کے بغیر علم جدید صحیح رخ پر آگے نہیں بڑھ سکتا' چنانچہ نہ یہ دنیا میں مفید ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کے اعتبار سے رحمت بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی دن فرما دیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ①﴾ ''پڑھئے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا''۔ علم جدید کے ذریعے علم ہدایت یعنی قرآن کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل کی جا سکتی ہے' دورِ حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دیا جا سکتا ہے اور عصر حاضر کے مسائل کو سمجھ کر علم ہدایت کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔

علم کی اہمیت پر زور دینے کے بعد آیت زیر مطالعہ میں اُن صلاحیتوں کا ذکر ہے جن سے ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ سماعت و بصارت کے علاوہ یہاں ''فواد'' کا ذکر ہے جس کے معنی دل کے بھی کیے جاتے ہیں اور عقل کے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو سننے' دیکھنے اور غور وفکر کی صلاحیت عطا فرمائی اور غور وفکر دل سے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حساسیت دل میں بھی رکھی ہے اور نیت بھی یہیں پیدا ہوتی ہے۔ وہ قلبِ مصطفیٰ ﷺ تھا جس پر قرآن کا نزول ہوا تھا۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھیں کہ جو صلاحیتیں ہمیں دی گئی ہیں روزِ قیامت ان کے بارے میں باز پرس ضرور ہو گی کہ انہیں استعمال کیا یا نہیں؟ اور اگر استعمال کیا تو کہاں؟ ہم سب کو سوچنا چاہیے کہ ہم ان صلاحیتوں کو محض ایک چھوٹی سی زندگی کو خوبصورت اور پُر آسائش بنانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں یا آخرت کی زندگی کو بھی بہترین بنانے کے لیے؟ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

تکبر کی ممانعت

آیت ۳۷ میں ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ㊲﴾ ''اور زمین پر اکڑ کر مت چلو' بیشک تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور

نہ پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ سکتے ہو‘‘۔ ہدایت دی گئی کہ انسان کسی بھی نعمت کے حصول پر نہ اترائے اور نہ ہی تکبر کرے۔ سب سے پہلے یہ حرکت شیطان نے کی تھی۔ وہ بڑا ہی عبادت گزار تھا۔ اس نے ایک مرتبہ تکبر کیا تو اللہ کی رحمت سے اسے دور کر دیا گیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم قرار دیا گیا۔ اب اس کی پیروی کرنے والے بھی جہنم میں ہی ڈالے جائیں گے۔ تکبر کی علامت یہ بھی ہے کہ انسان زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہے یا گردن اکڑا کر یا سینہ تان کر چلتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) ’’وہ شخص ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر ہوگا‘‘۔ سب سے بڑا اللہ ہے اور تکبر اُسی کو روا ہے۔ سنن ابی داؤد میں وارد حدیث قدسی کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ)) ’’تکبر میری چادر ہے!‘‘ بندے کی بندگی کا تقاضا ہے کہ وہ عاجزی اور انکساری کا رویہ اختیار کرے۔

آیت ۳۸ میں فرمایا گیا: ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾﴾ ’’یہ سب وہ امور ہیں جن کی برائی کا پہلو تمہارے رب کو ناپسند ہے‘‘۔ متذکرہ بالا تمام احکامات پر عمل نہ کرنا رب کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہی دلیل حرفِ آخر ہے کہ یہ چیز اللہ کو ناپسند ہے۔

قرآن‘ حکمت کا خزانہ ہے!

آیت ۳۹ میں ارشاد ہوا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ سب دانائی کی باتوں میں سے ہے جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہیں‘ اور اللہ کے ساتھ دوسرے معبود نہ بناؤ ورنہ ڈال دیے جاؤ گے جہنم میں ملامت زدہ اور دھتکارے ہوئے ہو کر‘‘۔ فرمایا گیا کہ یہ تمام احکامات حکمت کا مظہر ہیں۔ بعض بزرگانِ دین نے حکمت سے مراد صرف حدیث رسول ﷺ لی ہے‘ لیکن اس آیت کی رو سے قرآن میں بھی حکمت ہے۔

آیت زیر مطالعہ کے آخر میں توحید کا ذکر ہے۔ یہاں توحید نظری اور توحید عملی دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ شرفِ انسانیت کی معراج یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو پالے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔

شرک فی الذات: بدترین شرک

آیت ۴۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾﴾ ’’(اے مشرکو!) کیا تمہیں پسند کر لیا تمہارے رب نے بیٹوں کے لیے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا؟ کچھ شک نہیں تم کہتے ہو بہت بڑی بات‘‘۔ یہاں شرک فی الذات کا ذکر ہے یعنی مخلوق میں سے کسی کو خدا قرار دے دینا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ کی طرف بیٹے منسوب کیے۔ قریش نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے دیا۔ ان گمراہ کن تصورات پر اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا اظہار قرآن میں بار بار ہوا۔ سورۂ مریم میں ارشاد ہوا: ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾﴾ ’’قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں (اس بات سے) کہ لوگوں نے رحمان کے لیے بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا‘‘۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان احکامات پر عمل کرنے اور ہمارے معاشرے کو صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

کیا رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر نجات ممکن ہے؟(۲)

محمد سفیر الاسلام

انسان کی نجات میں ایمان بالرّسول ﷺ کی حیثیت

داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے سورۃ البقرۃ' آیت ۶۲ کی وضاحت میں مندرجہ ذیل فکر انگیز گفتگو فرمائی ہے:

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے) اور جو یہودی ہو گئے اور نصرانی اور صابی (دین ابراہیمی کے دعوے دار ستارہ پرست) جو کوئی بھی ایمان لایا (ان میں سے) اللہ اور یومِ آخر پر اور اُس نے اچھے عمل کیے تو اُن کے لیے (محفوظ) ہے اُن کا اجر اُن کے ربّ کے پاس' اور نہ ان پر کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ظاہر الفاظ کے اعتبار سے دیکھیں تو یہاں ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے غلط استدلال کرتا ہے تو اس کا پہلا اصولی جواب تو یہ ہے کہ بعض احادیث میں ایسے الفاظ بھی موجود ہیں: ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) تو کیا اس کے یہ معانی ہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے سے جنت میں داخل ہو جائیں گے' کسی عمل کی ضرورت نہیں؟ بلکہ کسی حدیث کا مفہوم اَخذ کرنے کے لیے پورے قرآن کو اور پورے ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھنا ہو گا۔ کسی ایک جگہ سے کوئی نتیجہ نکال لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ چھٹے رکوع کے آغاز میں یہ اصولی بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع چھٹے رکوع سے شروع ہونے والے سارے مضامین سے ضرب کھا رہا ہے' جس میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت بایں الفاظ موجود ہے:

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾

''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے' جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے' اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

اب فصاحت اور بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک بات بار بار نہ دہرائی جائے۔ البتہ یہ بات ہر جگہ مقدر (understood) سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ ساری گفتگو اسی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے اب یوں سمجھئے کہ آیتِ زیرِ مطالعہ میں ''فِیْٓ اَیَّامِهِمْ'' یا ''فِیْٓ اَزْمِنَتِهِمْ'' (اپنے اپنے دَور میں) کے الفاظ محذوف مانے جائیں گے۔ گویا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا [فِیْٓ اَیَّامِهِمْ] فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾

یعنی نجاتِ اُخروی کے لیے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے دَور کے نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک حضرت عیسٰیؑ نہیں آئے تھے تو حضرت موسٰیؑ کے ماننے والے جو بھی یہودی موجود تھے' جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے' آخرت کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے ان کی نجات ہو جائے گی۔ لیکن جنہوں نے حضرت عیسٰیؑ کے آنے کے بعد اُنؑ کو نہیں مانا تو اب وہ کافر قرار پائے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت عیسٰیؑ تک تمام رسولوں پر ایمان نجاتِ اُخروی کے لیے کافی تھا' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان نہ لانے والے کافر قرار پائیں گے۔

آیتِ زیرِ مطالعہ میں اصل زور اس بات پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی گروہ میں شامل ہونے سے نجات پا جاؤ گے' نجات کسی گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ نجات کی بنیاد ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اپنے دَور کے رسول پر ایمان لانا تو لازم ہے' لیکن اس کے ساتھ اگر عملِ صالح نہیں ہے تو نجات نہیں ہوگی۔ قرآن مجید کے ایک مقام پر آیا ہے: ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف: ۳۴) ''اور ہر اُمت کے لیے ایک خاص معین مدت ہے''۔ ہر اُمت اس معینہ مدّت ہی کی مکلّف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے ان پر تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ بعثتِ نبویؐ سے قبل ایسے

موحدین مکہ مکرمہ میں موجود تھے جو کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر یہ کہتے تھے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری بندگی کرنا چاہتے ہیں' لیکن جانتے نہیں کہ کیسے کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور فاطمہؓ بنت خطاب کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد زید کا یہی معاملہ تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے چلے گئے کہ: ''اے اللہ! میں صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں' مگر نہیں جانتا کہ کیسے کروں۔''(۳۶)

سوال و جواب' از مفتی محمد رفیع صاحب:

سوال: سورۃ المائدہ کی آیت ۶۹ میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ عمل صالح کو اختیار کریں گے' ان کی بخشش ہو جائے گی۔ اس آیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی نجات میں ایمان بالرسول کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ (علاؤالدین دسانی)

جواب: ''سورۃ المائدہ کی آیت درج ذیل ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۶۹﴾﴾

''(جزا و سزا کا قانون بالکل بے لاگ ہے' لہٰذا) وہ لوگ جو (اس نبی اُمّی پر) ایمان لائے ہیں اور جو (ان سے پہلے) یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ' اُن میں سے جن لوگوں نے بھی اللہ کو مانا ہے اور قیامت کے دن کو مانا ہے اور نیک عمل کیے ہیں تو اُن کے لیے (اللہ کے حضور میں) نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کوئی غم (وہاں) کھائیں گے۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کامیابی محض اس بات سے نہیں ہو جائے گی کہ فلاں آدمی مسلمان تھا' یہودی' صابی یا عیسائی تھا' یعنی کسی گروہ میں شمولیت سے نجات نہیں ہو جائے گی' بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی ایمان باللہ' ایمان بالآخرت کا حامل ہو اور اعمالِ صالحہ کو اختیار کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا کوئی چیز نہیں اور آدمی خواہ ان کا اقرار کرے' خواہ انکار' خواہ ان سے بے نیازی اختیار کرے' اس سے اس کی بخشش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہیں' ہرگز نہیں' صحیح بات یہ ہے کہ جس آدمی نے جان بوجھ کر محمد ﷺ کی تکذیب کی تو اسے ہدایت پر سمجھا ہی نہیں جائے گا اور اس کا ایمان باللہ' ایمان بالآخرت اور اعمالِ صالحہ سب رائیگاں ہو جائیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴿۱۳۷﴾﴾ (البقرہ)

''اور اِن کا اصرار ہے کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے۔ اِن سے کہہ دو: بلکہ ابراہیم کا دین اختیار کرو جو (اپنے پروردگار کے لیے) بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ اِن سے کہہ دو: ہم نے اللہ کو مانا ہے اور اُس چیز کو مانا ہے جو ہماری طرف نازل کی گئی اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد کی طرف نازل کی گئی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔ ہم اِن میں کوئی فرق نہیں کرتے (یہ سب اللہ کے پیغمبر ہیں) اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ پھر اگر وہ اُس طرح مانیں جس طرح تم نے مانا ہے تو راہ یاب ہوئے) اور اگر منہ پھیر لیں تو وہی ضد پر ہیں۔ سو اِن کے مقابلے میں اللہ تمہارے لیے کافی ہے' اور وہ سننے والا ہے' ہر چیز سے واقف ہے۔''

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر مسلمانوں کی طرح محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے تبھی راہ یاب ہوں گے' ورنہ نہیں۔ لہٰذا سورۃ المائدہ کی آیت سے یہ معنی لینے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے کہ ایمان بالرسالت ایک غیر ضروری چیز ہے۔ کسی بھی نبی کے دور میں اس پر ایمان سے محرومی' کسی صریح عذر ہی کی بنا پر قابل معافی ہو سکتی ہے۔

آج نبی مکرم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا پوری دنیا کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے' کیونکہ سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴿۱﴾﴾

''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تاکہ وہ جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا بنے۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ کا وجود' آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی برپا کی ہوئی

دینونت (نظامِ عدل وقسط) اب پوری دنیا کے لیے آپ ﷺ کی جانب سے بالفعل حجت بن چکی ہے۔ بس اُس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اب انسانوں کی طرف سے ہونے والی جدّوجُہد ہی باقی ہے اور وہ ظاہر ہے کہ انہی کے ذمے ہے‘ لہٰذا آپ ﷺ پر ایمان لانے سے انسان کی محرومی کسی عذر ہی کی بنا پر معاف ہوگی۔‘‘ (انتہٰی)

’گلوبلائزیشن‘ کے جلو میں ایک تحریک جو دبے قدموں سے عالمی سرزمین پر پیش قدمی کرتی آ رہی ہے‘ وہ ہے ’وحدتِ ادیان‘ جو اپنے یہاں باقاعدہ اب دستک دینے لگی ہے۔ اس نئے مہمان —— وحدتِ اَدیان —— کی سب سے پہلی فرمائش یہ ہے کہ مسلمانوں کی لغت سے ’کافر‘ ایسا خوفناک لفظ نکال دیا جائے۔ وہ سب اَفکار‘ وہ سب اَدیان اور وہ سب عقائد جو دینِ اسلام سے متصادم ہیں‘ اب باقی زمانے کے لیے ’کفر‘ کہلانے سے مستثنیٰ کر دیے جائیں!

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو تصویر یہ ’عالمی ثقافتی مہم‘ اِس عالَمِ نو کی بنانا چاہ رہی ہے‘ ہمارے یہاں پایا جانے والا ارجائی فکر کمال انداز سے اس ’تصویر‘ کو مکمل کرتا ہے! اصولِ ارجاء اسی لیے تو ہیں کہ ایمان اور کفر کے مابین جو ایک حد فاصل ہے اُس کو زیادہ سے زیادہ غیر مرئی بنا دیا جائے! ’کافر‘ کا لفظ آج دنیا کی کسی بھی قوم اور کسی بھی گروہ کے لیے معیوب ہے‘ خواہ وہ بت پرست کیوں نہ ہو‘ شیطان پرست (devil worshiper) کیوں نہ ہو‘ آگ کا پجاری کیوں نہ ہو‘ حتیٰ کہ شرمگاہوں کے مجسمے بنا کر ان کو پوجنے کا مذہب کیوں نہ رکھتا ہو‘ کسی کو ’کافر‘ نہ کہا جائے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا ’نکتہ نظر‘ ہے اور ’گلوبلائزیشن‘ کی نظر میں یکساں طور پر لائقِ احترام! گلوبلائزیشن کو ہمارے یہاں اِس کے سوا اور کیا چاہیے؟ یہ اُس کے لیے نعمت اور وہ اِس کے لیے غنیمت! اِن دونوں میں کیا خوب نبھ رہی ہے!

ڈاکٹر رتھ فاؤ کی وفات کے بعد جو بحث شروع ہوئی اس میں بھی بڑے زوردار انداز میں اس فکر کو پیش کیا گیا اور اس کے لیے قرآن کی ایک آیت کا بھی سہارا لیا گیا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ)

’’بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے‘ سو ان

(سب) کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے‘ اور نہ کوئی اندیشہ ان کے لیے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے۔‘‘

سورۃ البقرہ کی اس آیت سے جدت پسند اور ان کی دیکھا دیکھی کچھ کم علم لوگ یہ استدلال کرتے نظر آ رہے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بھی جنت میں جائیں گے‘ حالانکہ اسی سورت میں جا بجا یہود و نصاریٰ کو دعوتِ اسلام اور قرآن اور صاحبِ قرآن کے انکار پر انہیں وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس آیت سے یہی مراد تھی جو انہوں نے نکالی تو اس سے پہلے اور بعد میں یہود کو اسلام لانے کی دعوت دینے کی ضرورت کیا تھی؟ سورۃ البقرہ میں جو نصاریٰ کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کے مناظروں اور مباہلوں کے چیلنجز کا ذکر ہے تو ان کا مقصد کیا ہے؟

اسی طرح قرآن کی بیسیوں آیات یہود و نصاریٰ کے کفر اور اسلام میں ہی نجات بتا رہی ہیں‘ وہ کس لیے ہیں؟ مثلاً:

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ (آل عمران)

’’اور جو اختیار کرنا چاہے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تو یہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا‘ اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔‘‘

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (آل عمران)

’’دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے‘ اور اہل کتاب نے جو (اس دین سے) اختلاف کیا تو علم ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا۔ اور جو شخص اللہ کی آیتوں کو نہ مانے تو اللہ جلد حساب لینے والا (اور سزا دینے والا) ہے۔ پھر بھی اگر یہ آپ سے جھگڑیں تو کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور جنہوں نے میری اتباع کی ہے انہوں نے بھی۔ اور اہلِ کتاب سے اور (عرب کے) اَن پڑھ (مشرکین) سے کہہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے‘ اور اگر انہوں

نے منہ موڑا تو آپ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی حد تک ہے‘ اور اللہ تمام بندوں کو خود دیکھ رہا ہے۔‘‘

یہود و نصاریٰ اور باقی مشرکین کے متعلق ایک واضح اور فیصلہ کن قرآنی بیان پڑھیے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ؕ۶﴾ (البیّنۃ)

’’بے شک جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافر ہوئے وہ آتشِ دوزخ میں جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔‘‘

سوال یہ ہے کہ جب آپ کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے اور آپ ﷺ کا سن لینے کے بعد بھی ایک یہودی اور عیسائی کو ’خدا‘ اور کسی ’اگلے جہان‘ کو مان رکھنا اور ’بھلے کام‘ کر لینا نجات کے لیے کافی ہے (از روئے آیت البقرۃ) یعنی محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر بھی اُس کی جنت کھری ہے تو پھر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو نہ ماننے پر (سورۃ البینہ وغیرہ ایسے قرآنی مقامات پر) قرآن انہیں جہنم کی وعیدیں کیوں سنا رہا ہے؟ اب یا تو آپ قرآن کی ان باقی آیات کی تکذیب یا تاویل کریں یا ان قرآنی محکمات کو مانتے ہوئے آیت البقرۃ سے نکالے جانے والے اس متشابہ کو انہی محکمات کی طرف لوٹائیں۔

سلامتی اسی میں ہے کہ دین کے بنیادی امور (عقیدہ وغیرہ ایسے اُمہات المسائل) کی بابت صحابہ کرام ؓ اور سلف صالحین کے طریقے پر رہا جائے اور فہم نصوص میں ان کے راستے سے ہٹ کر کوئی نئی اپچ اختیار کرنے سے بچیں اور متشابہات میں محکم کی طرف رجوع کریں۔

جب ہم تفاسیر سلف کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس آیت کا سیاق وسباق یہ نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور ان کی نافرمانیوں کے تذکرے کے بیچ میں یہ آیت کریمہ بنی اسرائیل کے ایک باطل گھمنڈ کی تردید کے لیے آئی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف انہی کی نسل اللہ کے منتخب اور لاڈلے بندوں پر مشتمل ہے اور ان کے خاندان سے باہر کا کوئی آدمی اللہ کے انعامات کا مستحق نہیں ہے (آج بھی یہودیوں کا یہی عقیدہ ہے)۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ حق کسی نسل میں محدود نہیں ہے‘ اصل اہمیت ایمان اور نیک عمل کو حاصل ہے‘ لہٰذا جو شخص بھی اللہ عزوجل اور آخرت پر ایمان لانے اور عمل صالح کی بنیادی شرطیں پوری کر دے گا‘ خواہ وہ پہلے کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو‘ اللہ کے نزدیک اجر کا مستحق ہوگا۔

یہودیوں اور نصرانیوں کے علاوہ عرب میں کچھ ستارہ پرست لوگ رہتے تھے‘ جن کا دعویٰ تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں‘ مگر ان کے ہاں بہت کچھ بگڑ چکا تھا۔ ان لوگوں کو صابی کہا جاتا تھا‘ اس لیے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ کی نبوت کے بعد آپؐ پر ایمان لانے والے ہوں‘ یا یہود‘ عیسائی اور صابی جو آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے موجود تھے اور ’’جو بھی ایمان لایا اور اعمالِ صالحہ کیے‘‘ کے مصداق آنے والی زندگی میں اپنے اعمال اور ایمان کی جزا پائے گا۔ چنانچہ ابن کثیر‘ ابن ابی حاتم کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی ؓ نے فرمایا: ’’یہ آیت تب نازل ہوئی جب میں نے ان لوگوں کی نماز اور روزے کا ذکر کیا جن سے میں محمد ﷺ سے ملاقات سے پہلے ملا تھا۔‘‘(۳۷)

سلسلۂ عبارت کو پیش نظر رکھنے سے بھی یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے‘ بلکہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ اگر تفصیل میں بھی جائیں تو اسی آیت میں ایمان باللہ کی شرط کسی شبہ سے بچانے کے لیے کافی ہے‘ کیوں کہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو وحدہٗ لاشریک‘ یکتا اور بے مثل مانا جائے اور اس کے تمام احکام کی تعمیل کی جائے‘ لہٰذا یہ جملہ ایمان بالرسل‘ ایمان بالکتب‘ ایمان بالملائکہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ کوئی پیغمبروں‘ فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لائے بغیر اللہ اور آخرت کے دن پر کیسے ایمان لا سکتا ہے؟

داعیانِ وحدتِ ادیان سے چند موٹے موٹے سوالات

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ سے جو ماڈرنسٹ ’’مفکر‘‘ سکالر اور دانشور‘‘ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جنت میں صرف مسلمان نہیں جائیں گے‘ بلکہ یہود و نصاریٰ اور صابئین سب جنت میں جائیں گے‘ بشرطیکہ وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھیں اور نیک کام کریں‘ ان لوگوں کے دعوے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حصولِ جنت کے لیے رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان لانا ضروری بات نہیں اور کچھ یہ نتیجہ نکال لاتے ہیں کہ تمام مذاہب بس ایک ہی ہیں‘ صرف ناموں کا فرق ہے۔ اس آیت قرآنی سے یہ نتیجہ نکالنے میں یہ لوگ کس طرح تلبیس کے مرتکب ہوتے ہیں‘ اس کا

اوپر تذکرہ آیا ہے۔ان لوگوں سے چند موٹے موٹے سوالات یہ ہیں کہ:

(۱) یہ لوگ پھر عیسائی یا یہودی کیوں نہیں ہو جاتے؟ آخر جنت تو انہیں بھی ویسے ہی ملنے والی ہے جیسے مسلمان کو‘ تو پھر خود کو مسلمان کہلوانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ اگر رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان لانا اضافی شے ہے کہ اس پر ایمان لاؤ نہ لاؤ‘ اقرار کرو نہ کرو‘ اس سے کیا فرق پڑتا ہے‘ تو یہ لوگ اس کا انکار کر کے خود بھی اور اپنی آل اولاد کو بھی یہود و عیسائی کیوں نہیں بنا دیتے؟

(۲) دیگر اہل مذاہب کو اسلام کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ دیکھئے دعوت کی بنیاد یہی ہے نا کہ وہ غلط ہیں اور جنت کا حقدار بننے کے لیے ضروری ہے کہ درست بات پر ایمان لائیں۔ مگر جب وہ لوگ اپنے پہلے ایمان ہی کی بنیاد پر جنت کے حقدار قرار پا چکے تو انہیں ایمان کی دعوت و تبلیغ کا کیا مطلب؟ بس اچھی باتوں کی نصیحت وغیرہ ہونی چاہیے۔

(۳) اگر یہ سب لوگ ایسے ہی جنت کے حقدار تھے اور رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایمان بس ایک اضافی شے تھی‘ تو اللہ ربّ العزت نے سورۃ البقرہ اور آلِ عمران میں یہود و نصاریٰ سے اتنی طویل گفتگو کس لیے کی اور انہیں کس بات پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی تھی؟

علمائے عقیدہ کی آراء

علمائے عقیدہ نے قرآن اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفر ہو جانے کی یہ ایک ہی صورت بیان نہیں کی‘ بلکہ کفر کی متعدد صورتیں ہیں: کفرِ جحود‘ کفرِ تکذیب‘ کفرِ استکبار‘ کفرِ شک‘ کفرِ نفاق‘ کفرِ اعراض‘ وغیرہ۔ گویا صاف ٹھکرانا یا انکار کرنا تو دور کی بات‘ کوئی قرآن اور محمد ﷺ کے حق ہونے پر شک بھی رکھتا ہے تو وہ کافر ہے۔ قرآن اور محمد ﷺ سے اعراض کر لینا ہی کفر ہے اور یہ کفر کی سب سے عام صورت ہے۔ اِس شخص کا قرآن اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو کوئی توجہ نہ دینا بذاتِ خود کفر ہے۔ ’ٹھکرانے‘ اور ’جھٹلانے‘ کی نوبت نہیں بھی آتی تب بھی وہ اعراض کی وجہ سے کافر ہے۔

علمائے عقیدہ ’کفر‘ کی یہ سب اقسام اِسی لیے بیان کرتے ہیں‘ اور ان کا لُبِّ لُباب خود بخود یہ بنتا ہے کہ قرآن اور محمد ﷺ پر ’ایمان نہ لانا‘ خواہ اِس ’ایمان نہ لانے‘ کی کوئی صورت ہو‘ بجائے خود کفر ہے۔ دیکھئے امام ابن قیم نصوصِ شریعت اور دستورِ فقہاء کی روشنی میں ’کفرِ اکبر‘ کی ممکنہ صورتیں اختصار کے ساتھ کیوں کر بیان کرتے ہیں۔ (۳۸)

محمد ﷺ پر ایمان لانا یعنی مسلمان ہونا کرۂ ارض پر بسنے والے ہر اُس یہودی اور عیسائی پر جس نے محمد ﷺ کا سن رکھا ہو (خود آپ کے نزدیک) فرض ہے اور محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے والا ایسا ہر یہودی اور عیسائی (خود آپ کے نزدیک) دائمی جہنم کا مستوجب۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں:

’’بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیے میں لکھ دیتے کہ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے اور اب اس کا مفہوم یہ ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا لازم‘ لابد اور ناگزیر ہے۔

یاد رہے مولانا ابوالکلام آزاد سے اختلاف ہی اسی نکتے پر ہے۔ کاش وہ لکھ دیتے تو مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ کیوں کہ عقیدۂ توحید اگر اسلام کی بنیاد اور عقیدۂ آخرت روح تو عقیدۂ رسالت اسلام کا دروازہ ہے۔ بدقسمتی سے وحدتِ ادیان جیسے گمراہ کن نظریے کی زد اگر پڑتی ہے تو وہ اسلام کے عقیدۂ رسالت پر پڑتی ہے۔

اس کی مثال میں یورپ کے مستشرقوں کو پیش کر سکتے ہیں‘ جو آنحضور ﷺ کی بہ غایت درجے تعریف کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی اصلاح کو عزت کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں اور آپ ﷺ کو دنیا بھر کا بزرگ ترین مصلح بھی جانتے ہیں‘ لیکن نہ تو خود مسلمان اور آپؐ کے امتی کہلاتے ہیں اور نہ آپؐ کے دعوائے رسالتِ الٰہی کی تصدیق کرتے ہیں۔

آیت زیر بحث (البقرہ:۶۲) میں انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان کے ضروری ہونے کا یہ ہے کہ اس میں روزِ قیامت پر ایمان رکھنا ایمانیات و موجباتِ نجات میں شمار کیا گیا ہے اور روزِ قیامت پر ایمان بغیر کسی رسولِ برحق کی تعلیم کے نہیں ہو سکتا۔‘‘ (۳۹)

اسلام بطور دین

اللہ ربّ العزت نے فرمایا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدہ:۳)

’’آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے صرف اسلام ہی کو بطور دین قبول کیا۔‘‘

یعنی اسلام کے علاوہ اب کوئی بھی دین اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں اور اللہ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کسی بھی دوسری شریعت کو اب قبول نہیں فرمائے گا۔ اگر کوئی شخص تمام

اسلامی عقائد وعبادات پر عمر بھر عمل کر لے‘ لیکن ذاتِ مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہ لائے تو اس کے سب اعمال غارت جائیں گے اور اس کے منہ پر دے مارے جائیں گے۔ حاصل یہ کہ اُخروی نجات کا واحد معیار رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان لا کر توحید اور دیگر اسلامی عقائد وعبادات پر ایمان لانا ہے۔ اُخروی نجات کے لیے نہ تو نسب معیار ہے اور نہ خدمتِ انسانیت۔ ہر نیکی‘ نیکی شمار ہی اُس وقت ہوگی جب انسان اللہ کے حبیب ﷺ پر ایمان لائے گا۔ مذکورہ بالا مختصر وضاحت سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ دین بیزار طبقے کا مقصد سوائے فتنہ پھیلانے کے اور کچھ نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ، لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ، ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ، اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ)) (۴۰)

’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے‘ اس امت کا جو بھی فرد میری نبوت ورسالت کے بارے میں سنے‘ خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی‘ پھر وہ میری رسالت پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو وہ جہنمی ہے۔‘‘

سورۂ محمد کی آیت ۲ — ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد (ﷺ) پر نازل ہوئی ہے‘‘ — کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’اگرچہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہنے کے بعد اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی‘ کیوں کہ ایمان لانے میں محمد ﷺ اور آپؐ پر نازل ہونے والی تعلیمات پر ایمان لانا آپ سے آپ شامل ہے‘ لیکن اس کا الگ ذکر خاص طور پر یہ جتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ کے مبعوث ہو جانے کے بعد کسی شخص کا خدا اور آخرت اور پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کو ماننا بھی اس وقت تک نافع نہیں ہے جب تک کہ وہ آپ ﷺ کو اور آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ مان لے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری تھی کہ ہجرت کے بعد اب مدینہ طیبہ میں اُن لوگوں سے بھی سابقہ درپیش تھا جو ایمان کے دوسرے تمام لوازم کو تو مانتے تھے‘ مگر محمد ﷺ کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ (۴۱)

سورۂ آلِ عمران (آیت ۳۱) میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ﴾

’’فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو‘ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دے گا۔‘‘

اس آیت میں خطاب عام ہے یعنی تمام انسانوں سے جن میں یہود ونصاریٰ بھی آ گئے اور دیگر اہل ادیان بھی‘ اور سب کے لیے رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کی محبت اور اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (آل عمران)

’’اور اگر (یہ) اہل کتاب (جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں‘ تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لیے (ان کی حالت موجودہ سے جس کو بزعم خود اچھی سمجھتے ہیں) زیادہ اچھا ہوتا (کیوں کہ پھر یہ بھی اسی مذکورہ اچھی جماعت یعنی خیر امت میں داخل ہو جاتے‘ مگر ان کی حالت پر افسوس ہے کہ سب مسلمان نہ ہوئے بلکہ) ان میں سے بعضے تو مسلمان ہیں اور زیادہ ان میں کافر ہیں۔‘‘

صاحب ’البرہان فی توضیح آیات القرآن‘ سید مختار الدین شاہ نے آیت ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾ (البقرۃ) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’دوسرا فائدہ یہ کہ اس طرح کے خطاب سے اُمت کو خبردار کیا جاتا ہے کہ میرے اس حکم کی خلاف ورزی اس قدر گھناؤنا جرم ہے کہ اگر بالفرض والمحال خود رسول اللہ ﷺ بھی ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں گے‘ لہٰذا امتِ مسلمہ کو چاہیے کہ وہ کبھی بھی یہود ونصاریٰ کے اہواء اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔‘‘

اس کے بعد ’وحدتِ ادیان‘ کے نظریہ کو قبول کرنے کا کوئی جواز کسی مسلمان کے پاس باقی نہیں رہ جاتا — وجوہات درج ذیل ہیں:

یہ نظریہ اسلام سے اصولاً وفروعاً متصادم ہے‘ کیوں کہ اسلام کامل ومکمل ہے اور اس کے بعد تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں اور اب نجات صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۸۵﴾﴾ (آل عمران)

''اور جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا' اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔''

مزید فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴿۱۹﴾﴾ (آل عمران)

''بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے۔ اور اہل کتاب نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد آپس کی سرکشی اور حسد کی بنا پر ہی اختلاف کیا ہے۔ اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرے تو اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔'' (۴۲)

معروف واقعہ ہے نبی مکرم ﷺ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ دیکھا جس میں تورات سے کچھ چیزیں تھیں تو آپ ﷺ نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا:

((اَوَفِيْ شَكٍّ اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ اَلَمْ آتِ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً؟ لَوْ كَانَ اَخِي مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِيْ)) (۴۳)

''خطاب کے صاحب زادے! کیا تجھے میرے بارے میں کوئی شک ہے؟ کیا میں اس کی جگہ صاف وشفاف اور واضح تعلیمات نہیں لایا؟ اگر میرے بھائی حضرت موسیٰ زندہ ہوتے تو میری پیروی کیے بغیر ان کو چھٹکارا نہ ملتا۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور کہنے لگے: ہم یہود سے حدیثیں سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو لکھ لیا کریں؟ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِيْ))

''کیا تم بھی ایسے ہی حیران وسرگرداں ہو (اپنے دین پر مطمئن نہیں) جس طرح یہود و نصاریٰ حیران وسرگرداں ہیں! میں تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت لایا ہوں۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ تھا۔'' (۴۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ ، لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوْسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِيْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ، وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَاَدْرَكَ نُبُوَّتِيْ لَاتَّبَعَنِيْ)) (۴۵)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' اگر موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس آ جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ وہ خود بھی (یہاں) زندہ ہوتے اور میرا دورِ نبوت پا لیتے تو میری پیروی کرتے۔''

خلاصۂ بحث

پیغمبر کی ذات اس لیے بھی اہم ہے کہ اس ذات میں ثبوت ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ اس ذات کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ زندگی صرف عبادت نہیں ہے۔ زندگی کوشش ہے' زندگی جہاد ہے' زندگی محبت ہے' زندگی فتوحات ہے' زندگی تنہائی بھی ہے' مجلس بھی ہے' زندگی تنہائی کا سجدہ بھی ہے اور محفلوں کی رونقیں بھی —— اللہ کی محبت' انسانوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ (۴۶)

محال است سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

''اے سعدی! محمد مصطفیٰ ﷺ سے تعلق وابستہ کیے بغیر راہِ حق اختیار کرنا مشکل اور ناممکن ہے۔''

اور بقول علامہ محمد اقبال:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

''اپنے آپ کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ' کیوں کہ سارے کا سارا دین آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وابستگی میں ہے' اور اگر آپ ان تک نہ پہنچ سکے تو پھر سب کچھ (دشمنِ رسالت مآب ﷺ) ابولہب کی طرح بے کار ہے۔''

اور بقول بیدم وارثی:

بیدم یہی ہے حشر میں صورت نجات کی
جائیں خدا کے سامنے ہم مصطفیٰ کے ساتھ!

حواشی

(۳۶) بیان القرآن' ترجمہ ومختصر تفسیر' از ڈاکٹر اسرار احمدؒ حصہ اول' سورۃ البقرۃ' آیت ۶۲۔

(۳۷) تفسیر ابن کثیر' البقرہ:۶۲۔

(۳۸) مدارج السالکین شرح منازل السائرین ' ج ۱' ص ۳۴۷' دارالکتاب العربی ۔

(۳۹) واضح البیان' از مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی' ص ۳۶۵۔۳۶۶۔

(۴۰) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد ﷺ.....(ح:۱۵۳)

(۴۱) تفہیم القرآن' جلد پنجم' سورۂ محمد' حاشیہ ۴۔

(۴۲) تفصیل کے لیے دیکھئے: مجموعہ فتاویٰ ومقالاتِ متنوعہ از شیخ ابن بازؒ ص ۲۷۷ تا ۲۸۲۔

(۴۳) مسند احمد وسنن الدارمی۔ اِرواء الغلیل للالبانی (ح:۱۵۸۹) راوی : جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ

(۴۴) رواہ احمد والبیھقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

(۴۵) رواہ الدارمی ۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

(۴۶) حرف حرف حقیقت' واصف علی واصف۔

❁❁❁

بقیہ: متاثر کن داعیان الی اللہ کی محنت

اس ہدف کے حصول کے لیے لوگوں کے دلوں میں اللہ پر ایمان اور آخرت کا یقین پیدا کیا جائے' پھر آخرت میں کامیابی کے لیے ''سَعٰی لَھَا سَعْیَھَا'' کا نقشہ اور اس نقشہ میں مضامین حکمت وموعظت کا رنگ بھرا جائے۔ (ملاحظہ ہو راقم کا مضمون ''دعوت اِلٰی سبیل الربّ'') یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں میں یقین پیدا ہو جائے کہ حق یہی ہے اور اسی میں انسانی فلاح کا راز مضمر ہے۔ مزید یہ کہ کفر وشرک کو اس طرح واضح کیا جائے کہ ان کے اعمال ونظریات کا باطل اور بے ہودہ ہونے کا یقین انہیں حاصل ہو جائے اور اسلام کے دامن میں پناہ لیے بغیر کوئی چارہ انہیں نظر نہ آئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی کسی نہ کسی درجے میں اقامتِ دین کا کام لے اور ہمیں لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین! ❁❁❁

والدین کی قدر ومنزلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے والدین کے دل میں اولاد کے لیے بے انتہا محبت رکھی ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے وہ اپنی اولاد کی پرورش میں ہر ممکن جِدّوجُہد کرتے ہیں۔ وہ خود تو تکلیف برداشت کر لیتے ہیں مگر اولاد کی تکلیف ان کو پریشان کر دیتی ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں بچوں کو شعور نہیں ہوتا اور اکثر وہ ایسے کام کر لیتے ہیں جو تمیز یا اخلاق کے خلاف ہوتے ہیں' مگر والدین ان کو معذور جان کر ان کا رویہ برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ والدین کی محبت ہی کا تقاضا ہے کہ وہ سالہا سال اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں' مگر ان پر کوئی احسان نہیں جتاتے۔ ہر وقت ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کسی مشکل اور مشقت میں نہ پڑے۔ اگر کوئی مشکل آ پڑے تو والدین خود اس کا سامنا کرتے ہیں' مگر اپنی اولاد کو اس سے دور رکھتے ہیں۔

اولاد کی یہ محبت جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے' وہ بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہر طرح کے خطرات سے بچاتے اور ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ کسی صورت بھی اپنے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑتے اور دشمن جانوروں کے حوالے نہیں کرتے۔

انسانوں میں یہ محبت شدید ہوتی ہے۔ چھوٹے بچے ماں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ ماں کا رویہ اس قدر رحم کا ہوتا ہے کہ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ حد تو یہ ہے اگر کسی ناروا رویے یا نامناسب بات پر باپ قصوروار بچے کی تادیب کرنا چاہے تو ماں آڑے آتی ہے اور بچے کی غلطی کو جائز یا ناجائز طریقے سے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ بچہ گھر سے باہر کسی دوسرے بچے سے لڑ جھگڑ کر آئے یا کسی دوست کو مار کر آ جائے اور دوسرے بچے کی ماں شکایت لے کر آئے تو مارنے والے بچے کی ماں جائز یا ناجائز ہر طرح سے اپنے بچے کی مدافعت کرتی ہے' خواہ اسے جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔ وہ یہ کہہ دیتی ہے کہ میرا بچہ تو کبھی کسی سے لڑتا ہی نہیں۔ اسی

طرح باپ ہر وقت اپنے بچوں کا دفاع کرتا ہے اور انہیں کسی طرح خطرناک صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کے لیے ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے: ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ﴿٢٤﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اے میرے پروردگار! ان دونوں (یعنی ماں باپ) پر رحم فرما جیسا انہوں نے مجھے چھوٹی عمر میں پالا''۔ یعنی اے اللہ! جس طرح میرے ماں باپ نے میری غلطیوں اور خطاؤں پر کوئی مواخذہ نہ کیا اسی طرح تو ان کی خطاؤں سے درگزر فرما' اگرچہ ان کے گناہ سزا کا تقاضا کرتے ہوں۔

اولاد کو اپنے ماں باپ کے احسانات فراموش نہیں کرنے چاہئیں' بلکہ ہمیشہ ان کا احسان مند رہنا چاہیے۔ یہ تو اخلاق کا بھی تقاضا ہے کہ جو شخص احسان کرے جواب میں اس کے ساتھ بھی احسان کیا جائے۔ والدین تو وہ ہیں کہ وہ اپنی اولاد پر سالہا سال تک چھوٹے بڑے احسان کرتے ہیں' وہ بچے کی بے بسی کی عمر سے جوانی اور اس کے بعد تک بھی اس پر احسان کرتے ہیں۔ ان کی خوراک اور لباس کا خیال رکھتے ہیں' ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں' انہیں تعلیم دلواتے اور بھاری فیسیں ادا کرتے ہیں۔ اکثر والدین اپنی اولاد کی خواہشات اور مطالبات پورے کرنے کے لیے قرض لیتے یا ناجائز کمائی کماتے ہیں۔ اگرچہ ناجائز کمانا ان کے مواخذے کا باعث ہوگا تاہم اولاد کی چاہت کی خاطر وہ یہ بھی کر گزرتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ تنبیہ موجود ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ﴾ (التغابن:۱۴) ''اے ایمان والو! بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' سو ان سے بچ کر رہو''۔ یعنی ان کی جائز اور اپنے وسائل کے مطابق خواہشات ہی پوری کرو۔ اگر تم نے ان کی خاطر رشوت یا کسی طرح کی ناجائز کمائی کی تو گویا یہ اولاد تمہاری دشمن ہوئی' کیونکہ ان کی وجہ سے تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

اولاد پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی ان مشکلات اور تکالیف کو یاد رکھیں جو انہوں نے ان کی خاطر برداشت کیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں حکم ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ

الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿٢٣﴾﴾

''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان کے ساتھ ادب کے ساتھ بات کرنا۔''

اس آیت میں نہ صرف ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کے ساتھ انتہائی نرمی کا برتاؤ کرو' حد یہ کہ انہیں اف تک نہ کہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولاد جب جوان ہو جائے اور ماں باپ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے ادب کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ عقل سلیم کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جس ہستی نے تم پر اَن گنت احسان کیے ہوں اس کے احسانات کو نہ صرف یاد رکھا جائے' بلکہ اس کی قدر کی جائے اور اس کے ساتھ بھی بڑھ چڑھ کر احسان کیا جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کے علاوہ جہاں بھی بھلائی کرنے کا حکم ہے وہاں اول ذکر ماں باپ کا ہی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ﴾ (آیت ۲۱۵)

''(اے نبی ﷺ!) آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیں کہ جو مال خرچ کرنا چاہو وہ ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔''

یہاں بھی سب سے پہلے ماں باپ پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (آیت ۳۶)

''اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

اس کے علاوہ قرآن مجید کے اور مقامات پر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کا حکم ہے اور ساتھ ہی والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿١٤﴾﴾

''ہم نے انسان کو — جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے اور پھر دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے — اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔''

گویا قرآن مجید میں بار ہا والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک‘ نرم رویہ اور خوش کلامی ضروری ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمائی ہے۔ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اُس نے کہا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا باپ''۔ (بخاری و مسلم) ماں کا تین بار ذکر کرنے کے بعد باپ کا ذکر کیا گیا۔ ظاہر ہے اولاد کی پرورش میں ماں کا بہت بڑا کردار ہے۔ باپ گھر سے باہر کے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ ماں گھر پر بچوں کا دھیان رکھتی ہے۔ پھر اولاد کا جننا اور انہیں دودھ پلانا تو یکسر ماں ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ بتایا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ ایک آدمی اپنے ماں باپ کو روتا چھوڑ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ہجرت اور بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کو اس طرح خوش کر کے آؤ جس طرح انہیں رُلا کر آئے ہو۔'' (سنن ابوداوٗد) اللہ تعالیٰ کے حق کے معاً بعد قرآن اور حدیث میں ماں باپ کا ہی حق ہے۔ ماں باپ کی قدر و منزلت کا اندازہ اس حدیث سے کیجیے جسے حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو نیک اولاد ماں باپ کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے ایک مقبول حج کا ثواب بخشتا ہے''۔ لوگوں نے پوچھا: ''یارسول اللہ ﷺ اگر ایک دن میں سو بار اسی طرح رحمت کی نگاہ ڈالے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی سو بار ایسا کرے تب بھی (اسے ہر بار مقبول حج کا ثواب ملے گا)۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے اور پاک ہے''۔ (صحیح مسلم) یعنی اس کی رحمت بے حد حساب ہے۔ ویسے تو اللہ

تعالیٰ کی ہر صفت ہی بے انتہاء ہے مگر اس کی رحمت تو ہر شے پر محیط ہے۔

دُرِ منثور میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو اور اس کے رزق میں اضافہ ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک اور بھلائی کرے اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرے''۔ والدین کا ادب و احترام اور ان کی خدمت و فرماں برداری تو فرض کے درجہ میں ہے‘ جبکہ ان کی قدر و منزلت کی اس قدر اہمیت ہے کہ ان کے رشتہ داروں‘ دوستوں اور تعلق داروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ حضرت ابواُسید مالک بن ربیعہ ساعدیؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوسلمہ کا ایک آدمی آیا۔ اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ میرے والدین وفات پا چکے ہیں تو کیا ان کا کوئی حق میرے ذمہ باقی رہ گیا ہے‘ جسے ادا کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں‘ والدین کے مرنے کے بعد اولاد پر ان کا حق یہ ہے کہ ان کے لیے دعا استغفار کرتے رہیں‘ ان کی وصیتیں پوری کریں‘ ان سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور ماں باپ کے دوست احباب کی عزت اور خاطر داری کریں۔ (سنن ابوداوٗد)

جب قرآن مجید اور احادیث کی رو سے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور نرم رویے کی اس قدر تاکید ہے تو ظاہر ہے کہ ماں باپ کی بے ادبی اور ان کے ساتھ بدسلوکی بھی بہت بڑا گناہ ہوگا۔ یہ بات بھی رسول اللہ ﷺ کے فرمودات سے ظاہر ہے۔ حضرت ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ماں باپ تمہاری جنت بھی ہیں اور تمہاری دوزخ بھی''۔ (سنن ابن ماجہ)

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین اشخاص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے نہ فرض قبول فرمائے گا اور نہ نفل: والدین کا نافرمان‘ صدقہ کر کے احسان جتانے والا اور تقدیر الٰہی کا منکر''۔ (السنۃ لابن ابی عاصم) اسی طرح سنن النسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں داخل نہ ہوگا احسان جتانے والا‘ والدین کا نافرمان اور ہمیشہ شراب پینے والا۔''

حضرت کعب بن عجرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منبر کے قریب ہو جاؤ''۔ ہم لوگ حاضر ہو گئے۔ جب حضور ﷺ نے منبر کے پہلے درجے پر قدم رکھا تو کہا: ''آمین!'' جب دوسرے پر قدم رکھا تو کہا: ''آمین!'' جب تیسرے پر قدم رکھا تو کہا: ''آمین!'' جب آپ ﷺ خطبے سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا کہ ہم نے آپؐ سے آج وہ بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس وقت جبریل امین ؑ میرے سامنے تھے جب میں نے پہلے درجے پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو جائے وہ شخص جس نے رمضان کا مہینہ پایا پھر بھی اس کی بخشش نہ ہوئی۔ میں نے کہا: آمین! پھر جب میں دوسرے درجے پر پہنچا تو انہوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر ہو اور وہ درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا: آمین! جب میں تیسرے درجے پر چڑھا تو انہوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچے اور وہ (ان کی خدمت کر کے اور ان کو راضی کر کے جنت کا مستحق نہ ہو جائے)۔ اس پر بھی میں نے کہا آمین!'' (مستدرک حاکم)

چھوٹی عمر اور جوانی میں عموماً انسان ماں باپ کی قدر و منزلت سے غافل ہوتا ہے اور اپنے مفید یا بے ہودہ مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہوتا ہے۔ ان کی خدمت اور فرمانبرداری میں مستعد نہیں ہوتا۔ ماں باپ بھی اولاد کی حرکات کو برداشت کرتے رہتے ہیں، مگر بچے والدین کی قدر سے بے خبر رہتے ہیں اور ان کی نرمی، محبت اور بڑھاپے کی قدر نہیں کرتے۔ کچھ بچے تو اپنے والدین کے لیے اذیت کا باعث بن جاتے ہیں اور ان کے ساتھ بدمزاجی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ بوڑھے والدین ان کی بے رخی، بدمزاجی اور نافرمانی کو برداشت کرتے اور رنجیدہ رہتے ہیں۔ جب ایسی اولاد کے والدین فوت ہو جاتے ہیں تو انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے والدین کے احسانات کے بدلے میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ والدین تو چلے گئے اب ان کی خدمت کرنے اور اپنی بے ہودگیوں کی معافی مانگنے کا وقت بھی جاتا رہا۔ ایسی صورتِ حال میں اولاد اپنے والدین کی بخشش کے لیے استغفار کرتی ہے اور ان کا یہ عمل اور پچھتاوا خلوص کے ساتھ ہو تو ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور ان کا انجام نافرمانوں کا سا نہیں ہوگا۔ حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر کوئی بندہ

اپنی زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا اور والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا انتقال ہو گیا تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے لیے برابر دعا کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی بخشش کی درخواست کرتا رہے یہاں تک کہ اللہ اس کو اپنی رحمت سے نیک لوگوں میں لکھ دے۔'' (بیہقی فی شعب الایمان)

اسلام امید کا دین ہے، اگر کوئی انسان اپنا رویہ درست کر لے، پچھلے گناہوں پر شرمسار ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی والدین کی اہمیت قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کرتے رہا کریں۔ نیز بدقماش اولاد کے قصے بھی سناتے رہیں کہ کس طرح دنیا میں ہی ان کو سزا ملی اور وہ ذلیل و خوار ہو گئے۔ آخرت کی سزا تو ہے ہی۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ''ادب المفرد'' میں لکھا ہے کہ ایک قبرستان میں مغرب کے بعد ایک قبر پھٹتی تھی جس میں سے ایک شخص نکلتا جس کا سر گدھے کی مانند تھا اور وہ گدھے کی آواز نکال کر چند لمحے بعد قبر میں چلا جاتا۔ کسی نے لوگوں سے پوچھا: اس قبر والے کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہو رہا ہے؟ بتانے والے نے بتایا کہ یہ آدمی شراب پیتا تھا اور جب اس کی ماں اسے ڈانٹتی تھی تو کہتا تھا کہ کیوں گدھے کی طرح چلاتی ہے؟ (بکھرے موتی از مولانا یونس پالن پوری) یہ وہ ماں ہے جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ ماں باپ کی عظمت میں اس طرح کے واقعات سننے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔

والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقام و مرتبے کے مطابق اپنے بچوں کی تربیت کریں، انہیں رزق حلال کھلائیں اور اخلاقیات کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ تاکہ یہ بچے اس دنیا میں اپنے والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں اور آخرت میں صدقۂ جاریہ کا درجہ پائیں۔

❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

بقیہ: تاریخ تحریک آزادیٔ کشمیر

جموں کے بعد مہاراجہ کو پونچھ کی فکر ستانے لگی۔ پونچھ میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ یہاں بہت سے ریٹائرڈ فوجی بھی تھے۔ ان تک جب مسلمانوں کے قتل عام کی اطلاع پہنچی تو یہ فوراً لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وادی کے لوگوں نے عورتوں اور بچوں کو پاکستان منتقل کرنا شروع کیا اور خود سر پر کفن باندھ کر ڈوگرہ فوج سے لڑنا شروع کر دیا۔ چنانچہ راولاکوٹ‘ وادی جہلم اور بہت سے علاقوں سے ڈوگرہ فوج فرار ہو گئی۔

کشمیر کے لوگوں کی رشتہ داریاں افغانوں اور پٹھانوں کے محسود اور دیگر قبائل سے تھیں۔ عورتیں اور بچے جب وہاں پہنچے تو ان پر ظلم کی داستانیں سن کر ان کے خون کھول اٹھے۔ چنانچہ ان علاقوں سے لشکروں کے لشکر کشمیر کی طرف روانہ ہوئے اور چند ہی دنوں میں مظفر آباد اور ایبٹ آباد کے درمیان ہٹ راوی کے جنگل میں ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ خورشید انور نے اس لشکر کی کمان سنبھالی اور انھوں نے ڈوگرہ فوج سے لڑنا شروع کیا۔ چنانچہ مظفر آباد‘ کوٹلی‘ راولاکوٹ اور موجودہ آزاد کشمیر کو نہ صرف ڈوگرہ بلکہ ہندوستانی فوج سے بھی آزاد کروالیا گیا۔ مہاراجہ اس وقت بھارت فرار ہو چکا تھا اور اس نے بھارت سے مدد مانگی تھی۔ بھارت نے اس شرط پر مدد فراہم کی کہ وہ بھارت سے الحاق کی دستاویزات پر دستخط کرے۔ مہاراجہ نے فوراً حامی بھر لی۔ چنانچہ بھارتی فوجیں بھی سرینگر اور وادی کے دیگر حصوں میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔

یوں ریاست کا جو حصہ مجاہدین نے آزاد کروالیا وہ آزاد کشمیر کہلایا جبکہ باقی ماندہ کشمیر پر بھارت نے اپنا غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ چونکہ بھارت اپنی گھناؤنی کارروائیوں سے واقف تھا سو اُس نے دنیا کے سامنے یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق محض عارضی اور وقتی ہے‘ الحاق کا حتمی فیصلہ جموں و کشمیر کے باشندوں کی آزادانہ‘ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے کرایا جائے گا۔ اس بات کا اعلان پنڈت جواہر لعل نہرو نے کیا۔ چنانچہ اقوام متحدہ میں بھارت کی طرف سے دائر کردہ جنگ بندی کی اپیل منظور کر لی گئی اور بھارت نے اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کی کہ کشمیر کا فیصلہ استصوابِ رائے سے کیا جائے گا اور انھیں حق خود ارادیت دیا جائے گا۔ یوں ۱۵/ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ میں قرارداد حقِ خود ارادیت منظور کی گئی‘ لیکن بھارت آج تک اس پر عمل کرنے سے گریزاں ہے اور مسلسل عذر تراشیوں بلکہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد بھی کشمیریوں نے اپنی جدّوجُہد آزادی کو جاری رکھا اور اس میں حالات کے مطابق عروج و زوال آتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں محمد مقبول بٹ نے نیشنل لبریشن فرنٹ کی بنیاد رکھی جس کا مقصد بھی کشمیریوں کو آزادی دلوانا تھا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد تحریک آزادی کشمیر کو ایک نئی جہت ملی۔ یہاں بھی گوریلا جنگ کا آغاز ہوا اور آزادی کی بہت سی مسلّح تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ۱۹۹۰ء میں تحریک آزادی کشمیر میں بہت تیزی آئی۔ دوسری طرف بھارت سرکار اور فوج نے اس تحریک کو دبانے کے لیے ہر طرح کے مظالم اختیار کیے اور ہلاکو و چنگیز خان کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔

۹/۱۱ کے بعد جب دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کا آغاز کیا گیا اور امریکہ افغانستان میں آیا تو بھارت نے خطے میں اس کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے اقدامات کیے‘ جس کے باعث تحریک آزادیٔ کشمیر کمزور ہوئی‘ لیکن وہ مکمل طور پر ختم نہ کی جا سکی۔ اس کے مظاہر وقتاً فوقتاً ہمیں دیکھنے کو ملتے رہے۔ اس تحریک کو نئی جہت اس وقت ملی جب تین سال قبل کشمیریوں کے مقبول مجاہد مظفر وانی کو بھارتی فوج نے شہید کر دیا۔ اس کے بعد تحریک آزادی میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ بھارت کے لیے اب اس تحریک کو دبانا مشکل ہو گیا‘ لہٰذا اس نے آئین میں ترمیم کر کے آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵۔اے کو ختم کر دیا جس کے تحت مقبوضہ کشمیر کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور آئین کی یہ شقیں کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے سے روک رہی تھیں۔ بھارت کے ان تمام اقدامات کے باوجود آج بھی کشمیریوں کے حوصلے اسی طرح بلند ہیں۔ اس کی واضح مثالیں کشمیر میں بھارتی افواج پر ہونے والے حملے اور بھارت کے یوم جمہوریہ کو ایک بار پھر یومِ سیاہ کے طور پر منانے جیسے اقدامات ہیں۔ سخت ترین کرفیو اور محاصرے کے باوجود کشمیریوں نے ایک بار پھر پوری دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ ہم ہر صورت بھارت سے آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور پاکستان سے الحاق ہی کشمیریوں کی منزل ہے۔ ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

Sep 2019
Vol.68

Regd. CPL No. 115
No.9

Monthly Meesaq Lahore

سانحۂ کربلا
شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت وعظمت کی صحیح تصویر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنادیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد**

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص:110 روپے اشاعت عام:65 روپے
(علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون:3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org